سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری سنہ ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف سنہ ۸۲ء سے لے کر سنہ ۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپے۔

"منیجر"

جلد ۱۴۵ ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۴۱۰ھ مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۹۰ء عدد ۳

مضامین

بزمِ صوفیہ

مرتبہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم

بزم صوفیہ کے نئے اڈیشن کا برابر تقاضا ہو رہا تھا، اب وہ چھپ کر تیار ہے۔

قیمت: ۴۲/... "منیجر"

شذرات

۲۷ فروری کو ملک کی جن آٹھ ریاستوں اور ایک مرکزی علاقہ میں انتخابات ہوئے، ان میں بڑے پیمانے پر تشدد ہوا، بہار میں زیادہ خون خرابہ ہوا، اس سے پہلے لوک سبھا کے انتخابات میں بھی وہاں قتل و خونریزی ہو چکی تھی، اور گذشتہ سال جو ہولناک فسادات ہوئے اس نے تو ساری دنیا میں ہندوستان کو رسوا کر دیا، بھاگلپور کی بستیاں کھنڈروں اور ویرانوں میں تبدیل ہو چکی ہیں اور اب بھی وہاں امن و قانون کی حالت ابتر ہے، آٹھ ریاستوں میں خوف و دہشت گردی، دھونس اور زبردستی، جبر و تشدد اور قتل و غارت گری میں جو کسر رہ گئی تھی، اسے ہریانہ کے میہم حلقہ نے پورا کر دیا، یہاں سے ہریانہ کے وزیر اعلیٰ مسٹر اوم پرکاش چوٹالا ایک ضمنی الیکشن میں امیدوار تھے، وہ نائب وزیر اعظم مسٹر دیوی لال کے صاحبزادے ہیں جو ہریانہ کے ع خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ ہیں۔ اس لیے ہریانہ میں اپنی خاندانی حکومت سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہیں۔

انتخابات میں سماج دشمن اور جرائم پیشہ لوگوں کی زور زبردستی، دہشت گردی اور شرپسندی کے واقعات نے ہندوستان کی جمہوریت کو عریاں کر دیا ہے، جب لوگوں کو اپنی مرضی سے بے خوف و خطر ووٹ ڈالنے کا موقع نہ ملے، اور پرامن انتخابات کے بجائے انھیں گولیوں کا نشانہ بنا دیا جائے تو یہ جمہوریت کا مذاق اور سرکاری مشنری اور الکشن کمیشن کی کھلی ہوئی ناکامی ہے، جس کی ذمہ داری براہ راست سیاسی جماعتوں پر عائد ہوتی ہے جن کے سایے میں پل کر بدکردار اور جرائم میں ملوث افراد جوان ہوئے ہیں اور جن کے لیے ہر پارٹی کا دروازہ کھلا رہتا ہے، اور وہ صاف ستھرے لوگوں کے بجائے انھی کو ٹکٹ دیتی ہیں، اس طرح انتظامیہ کی نا اہلی، پولیس کی بدعنوانی اور سیاست دانوں کی حوصلہ افزائی نے تشدد پر آمادہ لوگوں کو اس قدر جری بنا دیا ہے کہ وہ پوری ڈھٹائی سے ہر قسم کے ظلم و زیادتی کا ارتکاب کرتے ہیں، اس تشویشناک صورت حال پر واقعی توجہ دینے اور بڑی فکرمندی سے خرابیوں کی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے، اگر سیاست میں اصول، کردار اور ایمانداری کو برتری حاصل نہ ہوئی اور ذاتی مفاد اور کنبہ پروری سے بالاتر ہو کر قوم و ملک کے مفاد کو مدنظر نہ رکھا گیا تو ملک تباہی سے نہیں بچ سکتا

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

انتخابات میں کانگریس کو سخت ناکامی سے دوچار ہونا پڑا، اور اسے فرقہ وارانہ سیاست کو فروغ دینے، سیکولر اور جمہوری روایات سے انحراف اور قول و عمل کے تضاد کی پوری سزا مل گئی، مہاراشٹر میں اسکی حکومت بن گئی ہے مگر یہاں بھی مکمل اکثریت حاصل نہیں کر سکی ہے، انتخابات کا پورا فائدہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو ہوا ہے، مدھیہ پردیش اور ہماچل پردیش میں بلا شرکت غیرے اس نے زمام اقتدار سنبھال لیا ہے، راجستھان میں بھی وہی سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری ہے، گجرات اور بہار میں جنتا دل کو اس کی حمایت یا شرکت کی احتیاج ہے، اس کا اثر لامحالہ مرکزی حکومت پر بھی پڑے گا، اگر بھارتیہ جنتا پارٹی اس میں عملاً شریک نہ ہو تو بھی اس کا دباؤ بہت بڑھ جائے گا، اس کی "فتح مبین" کا سبب فرقہ وارانہ سیاست کا عروج اور ہندو احیاء پرستی ضرور ہے، لیکن اس کو پیدا کرنے میں مسلمانوں اور ان کے جذباتی لیڈروں کا دخل بھی کم نہیں ہے، مختلف انتخابی حلقوں میں کئی کئی مسلم امیدواروں کا ہونا، مسلم ووٹوں کی تقسیم کو نہ روکنا اور سیکولر اور جمہوریت پسند افراد اور جماعتوں کو ووٹ نہ دینا کس کی غلطی ہے؟ اب بھی وقت ہے کہ مسلمان اپنے جائز حقوق و مطالبات کو پورا کرنے کے لیے اپنے اندر قوت و اتحاد پیدا کر کے اپنا وزن محسوس کرا دیں، ورنہ اس سے بدتر حالات سامنے آنے والے ہیں ع ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا۔

روس دنیا کی دو بڑی طاقتوں میں سے ایک ہے، لیکن اس کے اور کمیونزم کے زوال کا دور شروع ہو چکا ہے، پے در پے ایسی اطلاعات آ رہی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سوویٹ یونین اور چین میں بھی جبر و تشدد پر مبنی اشتراکی نظام کے خلاف لوگ آمادۂ بغاوت ہیں، افغانستان سے روسی فوجوں کو بہت بے آبرو ہو کر نکلنا پڑا، اور اب وہاں کی کٹھ پتلی حکومت روس کی مکمل پشت پناہی کے باوجود دم توڑتی دکھائی دے رہی ہے، مشرقی یورپ میں ہنگری، چیکوسلواکیہ، پولینڈ، رومانیہ، بلغاریہ اور مشرقی جرمنی روس کے تسلط سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں، دیوار برلن کھولی گئی تو مشرقی جرمنی کے لوگ مسرت سے جھوم اٹھے، اور اس مصنوعی دیوار کی حد پار کر کے مغربی جرمنی

جا پہونچے، خود سوویٹ یونین کی اپنی ریاستوں اور وسط ایشیا میں بھی بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے جس کے مقابلے میں روسی جارحیت کو عجز و درماندگی لاحق ہو رہی ہے۔

۶۔ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

بیداری اور انقلاب کے اثرات وسط ایشیا کی مسلم اور بالٹک جمہوری ریاستوں میں شدت اختیار کرتے جا رہے ہیں، جہاں آزادی اور حق خود اختیاری کے لیے جنگ شروع ہو گئی ہے، آذربائیجان میں روس کو فوج کشی بھی کرنی پڑی، ہندوستان نے کمزور اور مجبور قوموں کے حق خود ارادیت کی ہمیشہ حمایت کی ہے، لیکن بعض غیر مسلم اخبارات اس بیداری اور حق خود اختیاری کے مطالبہ پر برہمی ظاہر کر رہے ہیں، اور اس کی تعبیر "علحدگی" سے کر رہے ہیں، آرمینیا کو چھوڑ کر تمام ریاستوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، مسلمانان عالم کو ان سے اس لیے دلچسپی ہے کہ یہ عرصہ تک ان کی علمی و دینی سرگرمیوں کا مرکز رہ چکی ہیں، امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ اور دوسرے علمائے اسلام کا تعلق انہی ریاستوں سے تھا، اور یہ سامانیوں، سلجوقیوں، عثمانیوں اور تیموریوں کے زیر نگیں رہی ہیں۔

گورباچوف ایک حقیقت پسند اور مدبر سیاست داں ہیں، انھوں نے محسوس کر لیا ہے کہ نہ آزادی و بیداری کی لہر رکنے والی ہے اور نہ اشتراکی نظام کی بوسیدہ عمارت باقی رہنے والی ہے اس لیے انھوں نے روس کا آہنی شکنجہ ڈھیلا کر دیا ہے، اور کئی ریاستوں کے بنیادی حقوق تسلیم کر کے انھیں اپنی معاشی پالیسی بنانے کی آزادی دے دی ہے، گذشتہ برس روس میں پہلی بار انتخابات ہوئے جن میں ایسے لوگ بھی منتخب ہوئے جو روسی نظام اور اس کے حکمرانوں سے اختلاف کرنے کی جرأت کرنے لگے ہیں جس کا کوئی تصور بھی اس سے پہلے وہاں نہیں کیا جا سکتا تھا، حال ہی میں خبر آئی ہے کہ روس نے ستّر برس بعد نجی ملکیت کا حق بھی تسلیم کر لیا ہے، اس لیے انھیں مسلم ریاستوں کی آزادی و خود مختاری کے مطالبہ کو ماننے میں بھی لیت و لعل نہیں کرنا چاہیے، روس کی شکست و ریخت سے خود ہی ظاہر ہے کہ صدائے حریت کو جبر و قہر سے دبایا نہیں جا سکتا۔

مقالات

ثلاثۂ غسّالہ

بنگال میں تصنیف شدہ کتابوں کا ایک اہم ماخذ

از
جناب عارف نوشاہی صاحب۔ جامعہ تہران۔ ایران

حکیم حبیب الرحمن مرحوم (ڈھاکہ) بنگال کے جادو نگار ادیب اور نادرۂ روزگار طبیب تھے، وہ مولانا شبلی مرحوم کے دوستوں میں تھے، اور ان کے بعد ان کی دوستی و محبت کا سلسلہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی طرف منتقل ہوا، ان دونوں کے علاوہ دار المصنفین اور معارف کے بھی بڑے قدر دان تھے، معارف میں ان کے بعض مضامین بھی چھپتے رہے ہیں، "ثلاثۂ غسالہ" کی تالیف مولانا شبلیؒ کے ایماء سے شروع کی تھی، اور یہ نام مولانا سید سلیمان ندویؒ کا تجویز کیا ہوا ہے وہ رقمطراز ہیں:

"موصوف بنگال کی عربی و فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی تصنیفات کی مفصل فہرست لکھنا چاہتے تھے، اس کا نام میں نے تین کی مناسبت سے "ثلاثۂ غسالہ" رکھا تھا، اور اس میں دوسری مناسبت یہ تھی کہ حافظ نے سلطان بنگال کے نام جو غزل لکھ کر بھیجی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اس کا مطلع یہ ہے ؎

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود ویں بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود"

(معارف فروری ۱۹۳۳ء)

ہم بڑی مسرت سے حکیم صاحب مرحوم کی اس تصنیف لطیف پر جناب عارف نوشاہی صاحب کا یہ عمدہ مقالہ شائع کر رہے ہیں، انھوں نے حکیم صاحب کا مختصر حال بھی لکھا ہے، اور ان کی تصنیفات کا ذکر بھی کیا ہے، یہ مقالہ پروفیسر مختار الدین احمد سابق صدر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وساطت سے موصول ہوا ہے جس کیلئے ہم ان کے بھی ممنون ہیں، انھوں نے اس میں جابجا حاشیوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔

"معارف"

★

شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن اخون زادہ کا تعلق افغان، پشتون نشین علاقے سے ہے، جہاں علماء "اخوند" کہلاتے ہیں، ان کے والد اخوند محمد شاہ عرف بادشاہ میاں بونیر، پاکستان کے شمالی علاقے سوات کے رہنے والے تھے، وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے دیوبند گئے، مولانا اشرف علی تھانوی (م ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) ان کے ہم درس تھے[1] تعلیم مکمل ہوئی تو معاش کی فکر دامن گیر ہوئی، اس کی تلاش میں ڈھاکہ پہونچے، جو اس وقت نواب احسن اللہ (م ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۲ء) کے تصرف میں تھا، جن کی علم پروری سے

[1] مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ "ان کے والد اخوند محمد شاہ صاحب مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے شاگردوں میں تھے، لکھنؤ سے ڈھاکہ اپنے ماموں محمد نعمان صاحب مرحوم کے یہاں آئے اور یہیں شادی کر کے بس گئے اور اس تقریب سے سرحد ہند کی یہ دولت بنگال کی قسمت میں آئی" (یادِ رفتگان ص ۳۴۲) "معارف"

ڈھاکہ آباد تھا، اخوند محمد شاہ بھی ان ہی کی مہربانیوں کے اسیر ہوئے اور وہیں آباد ہو گئے۔

حکیم حبیب الرحمٰن ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے، دس برس کی عمر میں وہ شعر کہنے لگے تھے، علم طب حکیم عبدالمجید خان سے حاصل کیا اور اس میں کمال کا درجہ پایا، اور ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء تک انھوں نے تعلیم سے فراغت حاصل کر لی، اس کے بعد ان کی مطب کی مصروفیت اور متاہلانہ زندگی شروع ہوئی، تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) کے واقعہ کے بعد ان کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا، سر سلیم اللہ (۱۸۸۴ - ۱۹۱۵ء) انکے سیاسی مرشد تھے، انھوں نے انہی کے ساتھ کام کیا، اور وہ بنگال میں مسلم لیگ کے جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے، ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے وادیٔ صحافت میں قدم رکھا اور اخبار کا اجراء کیا، بعد میں وہ تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے، ڈھاکہ میں انجمن اردو مشرقی بنگال اور حبیبیہ طبیہ کالج بھی انھی کا قائم کیا ہوا تھا، ان کے دولت کدے پر ہر مہینے محفل شعر و سخن بھی منعقد ہوتی تھی، غرض حکیم صاحب ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے، اور وہ شاعر، عالم دین، طبیب، ادیب، سیاست داں، صحافی، مدرس اور خدمت گذار قوم کی حیثیت سے بھرپور اور متحرک زندگی گذار کر یکم ربیع الآخر ۱۳۶۶ھ/ ۲۳ فروری ۱۹۴۷ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے[1]

علمی آثار | جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا، حکیم حبیب الرحمٰن نے کم سنی ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا،

[1] "اقبال عظیم": مشرقی بنگال میں اردو ص ۱۱۰ - ۱۱۶ ملخصاً۔ خواجہ ناظم الدین نے "ڈھاکہ پچاس برس پہلے" کے تعارف میں حکیم صاحب کی تاریخ وفات آزادیٔ پاکستان (اگست ۱۹۴۷ء) کے بعد لکھی ہے جو درست نہیں، میں نے ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر (جامعہ ڈھاکہ) کے تتبع میں ایک مضمون میں سال وفات ۱۹۴۶ء درج کر دیا تھا، وہ صحیح ثابت نہیں ہوا۔

ثلاثہ غسالہ میں "سوز ابد" کے مصنف منشی عبدالرحیم آبد عظیم آبادیؒ[1] کا تذکرہ کرتے ہوئے حکیم صاحب لکھتے ہیں:

"میری سب سے پہلی غزل بعہدہ سادگی کی انھوں نے اصلاح فرمائی تھی"۔[2]

حکیم صاحب کا تخلص احسن ہے، انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز بھی منظوم کتاب سے کیا:

۱۔ **نعت ہی نعت حصہ سوم**: اس کتاب کے بارے میں خود حکیم صاحب کا بیان ہے:

"مطبوعہ شکل میں میری پہلی کوشش یعنی نعتیہ قصائد و غزلوں کا مجموعہ، اور آج سے چالیس برس اُدھر کی تالیفی یادگار، وطن دوستی کا پتہ اس سے بھی لگتا ہے کہ کچھ کلام ایسے شعرائے ڈھاکہ کا ایسا موجود ہے جو سوائے اس کے کسی اور طرح میسر ہی نہیں آسکتا"

---

[1] منشی عبدالرحیم آبد عظیم آباد کے رہنے والے تھے، ۱۳۱۰ھ میں ڈھاکہ گئے، اور برسوں وہاں مقیم رہے، وہاں ایک نکاح بھی کر لیا تھا، لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی، محلہ بخشی بازار میں رہتے تھے، نوجوانوں کے شعر و سخن کی پرداخت ان کے ذمہ تھی، اسی پر معاش کا دارومدار تھا، تقریباً ۱۲ سال ڈھاکہ میں رہنے کے بعد بیوی کے مرنے پر کلکتہ جا کر مچھوا بازار میں مقیم ہو گئے، ابتدا میں خواجہ محمد شاہ شہرت عظیم آبادی کے شاگرد ہوئے پھر وہ حکیم سجاد موہانی سے مشورہ سخن کرنے لگے، ابتدا میں نعت کہتے تھے، ان کے بعض اشعار بہت دنوں تک میلاد خوانوں کی زبانوں پر رہے، "سوز ابد" کے نام سے ان کا پہلا دیوان غالباً ۱۳۴۳ھ میں شائع ہوا، ان کی وفات ۱۹۲۵ء کے بعد غالباً کلکتہ ہی میں ہوئی (حکیم حبیب الرحمن: "ڈھاکہ کا پہلا گلدستہ" اور رسالہ معیار پٹنہ جولائی ۱۹۳۶ء) [2] ثلاثہ غسالہ: مسودہ حکیم حبیب الرحمن۔ مخزونہ کتب خانہ جامعہ ڈھاکہ۔

۴۴ صفحات پر مشتمل میرے پاس جو نسخہ ہے وہ ۱۹۰۰ء میں مطبع رزاقی کانپور کا چھپا ہوا ہے، اولہٗ:

ہر عمل میں بندگان باخدا — کرتے بسم اللہ سے ہیں ابتدا
نوحؑ نے چاہی جو کشتی کی نجات — پہلے بسم اللہ مجریہا کہا[1]

۲۔ **الفارق**: یہ حکیم صاحب کے تعلیمی دور یعنی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء کی تصنیف ہے، صفحات ۸۰، یہ دو مقالوں پر مشتمل ہے، پہلا مقالہ طب نظری پر اور دوسرا طب عملی پر، مجموعی طور پر ۱۲۸۵ امراض کا ذکر ہے، اور اس میں کچھ اطباء کا تذکرہ بھی ہوا ہے[2] حکیم محمد اجمل خان دہلوی نے یہ رسالہ دیکھا تو اس کے پچیس نسخے خریدے، اور نوجوان مصنف کی حوصلہ افزائی کی۔[3]

۳۔ **حیات سقراط**: نام سے ظاہر ہے کہ یونانی فلسفی سقراط کے حالات پر ہے، یہ بھی مصنف کے طالب علمی کے دور کا لکھا ہوا رسالہ ہے جو چھپ چکا ہے۔[4]

۴۔ **ترک موالات پر مستند علمائے ہند کی رائے**: اس رسالے کو ہم حکیم صاحب کی سیاسی بصیرت کا ترجمان قرار دے سکتے ہیں، ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کے ایماء پر تحریک ترک موالات چلی تھی، حکیم صاحب کے بقول:

"نن کوآپریشن نے جس کا ترجمہ "ترک موالات" مسلمانوں کی ترغیب کے لیے کیا گیا تھا سب سے زیادہ نقصان بنگال کے مدارس ... کو پہونچایا!"... نن کوآپریشن کی دیگر شرائط سے ہم لوگوں کو اختلاف نہ تھا، لیکن تعلیمی مقاطعہ ہمارے خیال میں محض

---

[1] مصدر سابق [2] مشرقی بنگال میں اردو ص ۱۱۱ - ۱۱۲ [3] حکیم حبیب الرحمن: آسودگان ڈھاکہ ص ۱ [4] مصدر سابق

فضول، بلکہ بنگال کے مسلمانوں کے لیے سم قاتل تھا، اور پھر کم از کم ہندو لیڈروں کی ذہنیت پر ہم کو معقول شبہات تھے، اس لیے ڈھاکہ میں چند ہمدرد مسلمانوں نے "حفاظت تعلیم مسلمانان" کے نام سے ایک کمیٹی بنائی تھی۔"

حکیم حبیب الرحمٰن نے ترک موالات کے مسئلے پر علمائے ہند کی آرا جمع کیں اور انھیں رسالہ کی شکل میں مرتب کیا، جو مذکورہ کمیٹی کی طرف سے کثیر تعداد میں شائع کیا گیا، بعد میں اس کا بنگالی میں ترجمہ بھی طبع کرا کر تقسیم کیا گیا۔ یہ رسالہ حقیقت پریس لکھنؤ سے ۴۴ صفحات پر چھپا، اور اس نے اچھا اثر پیدا کیا، اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا، اب یہ دونوں اشاعتیں کمیاب ہیں۔[1]

۵۔ **مقدمات دیوانی کا دستور العمل:** ولیم میکفرسن سپریم کورٹ کلکتہ کی انگریزی کتاب کا ترجمہ، مطبوعہ بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ، ۵۸۷ صفحات[2]

قبل ازیں اسی انگریزی کتاب کا جس کے شریک مصنف اسٹرا کوٹی اور جارج اسمولٹ نیگن بھی ہیں، منشی نصیر الدین احمد نے بامحاورہ سلیس اردو ترجمہ کیا تھا جو "دستور العمل عدالت دیوانی حکومت فورٹ ولیم" کے نام سے ۱۸۵۱ء میں چھپا، مگر یہ ترجمہ صرف پہلے نو ابواب پر مشتمل تھا۔[3]

"آسودگان ڈھاکہ" حکیم صاحب کی وفات سے صرف چار ماہ پہلے شائع ہوئی تھی، اس کے دیباچے پر تاریخ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء درج ہے، اور مصنف نے اپنی علالت اور چل چلاؤ کا یوں ذکر کیا ہے:

۱ ثلاثۂ غسالہ ۲ مشرقی بنگال میں اردو ص ۱۱۳ ۳ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ: کتابیات تراجم ۱: ۲۸۶، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۶ء۔

"اب کہ داہنی آنکھ میں پانی اتر رہا ہے، قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں، کتب خانہ جو ساری زندگی کا اندوختہ ہے، بے ترتیب پڑا ہے، کام بہت اور زندگی ختم ہو رہی ہے، ساتھ والے جا چکے ہیں، جو ہیں چلنے پر طیار (کذا) بیٹھے ہیں، اگر اس عمر میں اپنے رسائل و کتب کی اشاعت ہی کرا سکا تو سمجھوں گا کہ میں نے زندگی بیکار نہیں کھوئی۔"[1]

اسی کتاب کے شروع میں "معذرت و شکریہ" کے عنوان کے تحت حکیم صاحب نے یہ اطلاع دی ہے:

"آسودگان ڈھاکہ، سلسلۂ تاریخ ڈھاکہ کی پہلی کڑی ہے، دوسری کڑی 'مساجد ڈھاکہ'، اور تیسری کڑی 'ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے'، اور چوتھی کڑی 'شعرائے ڈھاکہ' ہے، مگر مسک الختام 'ثلاثۂ غسالہ' ہے، زندہ رہا اور توفیق الٰہی شامل رہی تو (ان شاء اللہ) یہ سارے خرافات چھپ جائیں گے ورنہ میری وصیت کے مطابق تمام مسودے ڈھاکہ یونیورسٹی کو نذر کر دیے جائیں گے، یا میرے بعد کن فیکون شد، شدہ باشد۔"

کتاب آسودگان ڈھاکہ تو حکیم صاحب کے جیتے جی چھپ ہی گئی، ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے بھی ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی، ثلاثۂ غسالہ بھی جیسے تیسے دستیاب ہے، مگر مساجد ڈھاکہ اور شعرائے ڈھاکہ کا کچھ اتا پتا نہیں ہے، حالانکہ آسودگان ڈھاکہ کی طباعت کے وقت:

"مساجد ڈھاکہ کے بارے میں ایک رسالہ تیار ہے، جو اس رسالہ (آسودگان ڈھاکہ

۱ آسودگان ڈھاکہ ص ۳

کے متصل بعد ہی اشاعت پائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ "[1]

یہ الفاظ خود مصنف کے تھے، یعنی کتاب موجود تھی اور صرف پریس میں جانا باقی تھا، مگر اقبال عظیم نے حکیم صاحب کے حالات میں عجیب بات لکھی ہے:

" دو کتابیں ان کے نام سے اور منسوب ہیں، یعنی 'شعرائے ڈھاکہ' اور 'مساجد ڈھاکہ' لیکن پہلی کتاب کا کہیں وجود نہیں، خاندان خواجگان کے معتبر حضرات اس سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، غالباً یہ سہو 'ثلاثہ غسالہ' سے ہوا ہو، 'مساجد ڈھاکہ' ہنوز نامکمل تھی کہ حکیم صاحب کا انتقال ہوگیا، آخرالذکر کتاب کا علم خواجہ محمد عادل صاحب کو ہے کہ اسکی ترتیب میں حکیم صاحب نے ان سے بہت امداد لی تھی "[2]

بعض اوقات بے احتیاطی سے الفاظ کا استعمال کس قدر ابہام بلکہ غلط فہمی پیدا کر دیتا ہے، منقولہ بالا عبارت کے ٹکڑے میں اقبال عظیم صاحب کے استعمال کردہ الفاظ "منسوب" اور "سہو" اس کی مثال ہیں، ہم نے حکیم صاحب کا بیان بھی اوپر درج کیا ہے یہ سب کتابیں ان کی اپنی تصنیف کی ہوئی ہیں، اور جب وہ صراحت کے ساتھ شعرائے ڈھاکہ اور ثلاثۂ غسالہ کو الگ الگ کڑیاں قرار دے رہے ہیں تو ثلاثۂ غسالہ کو شعرائے ڈھاکہ کیسے مان لیا جائے۔

مساجد ڈھاکہ کا مسودہ بھی مکمل تھا، اور چھپنے کے لیے تیار، مگر اقبال عظیم صاحب اسے بھی نامکمل بتاتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ حکیم صاحب کی وفات کے بعد شعرائے ڈھاکہ اور مساجد ڈھاکہ کے مسودات عدم توجہ کے باعث ضائع ہوگئے ہوں[3]، جیسا کہ ان کے دیگر

---

[1] آسودگان ڈھاکہ ص ۲　[2] مشرقی بنگال میں اردو ص ۱۱۳　[3] خواجہ ناظم الدین 'ڈھاکہ پچاس برس پہلے' کے تعارف میں لکھتے ہیں "ایک کتاب انھوں نے اپنی زندگی میں شائع کی تھی جس میں ڈھاکہ کی پرانی مساجد کی تاریخ اور حالات بیان کیے ہیں" (ص ط طبع لاہور) کہیں خواجہ صاحب کو 'آسودگان ڈھاکہ' سے التباس تو نہیں ہوا، جو ہر چند مزارات کی تاریخ ہے۔

نوادر ہوئے ہیں، اور اقبال عظیم صاحب نے اس کی داستان رقم کی ہے۔

تاریخ ڈھاکہ کی پہلی اور تیسری کڑی دستیاب ہے، اور ان کا تعارف حسب ذیل ہے

۶۔ **آسودگانِ ڈھاکہ** : ۱۵۸ صفحات کا یہ رسالہ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں بحسن سعی مرزا منظر علی منظر، منظر پریس مہاوٹ ٹولی ڈھاکہ میں چھپا، اور امدادیہ لائبریری چوک بازار ڈھاکہ سے شائع ہوا، اس کے سرورق پر یہ عبارت چھپی ہے:

ہندوستان کے مشرقی گہوارۂ تمدن اور بنگال کے

مرکز تہذیب و معاشرت

یعنی

ڈھاکہ اور اوسکے ملحقات کے قبور مسلمین کے حالات

آسودگان ڈھاکہ

جس میں

تلاش و تحقیق کے گراں مایہ نتائج پہلی بار پیش کیے گئے ہیں

اور بنگال کی ضمنی تاریخ پر ایسی روشنی ڈالی گئی ہے

کہ ہر زاویۂ مستور جگمگا اٹھا ہے

اس زمانے میں بلدیۂ ڈھاکہ نے شہر کے جو سات وارڈ بنائے تھے مصنف نے اسی کے مطابق ہر وارڈ میں موجود مزارات کا حال لکھا ہے، اس کے بعد مضافات شہر کے مزارات کا اور شیعہ حضرات کی قبروں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے۔

حکیم صاحب نے اپنے طرز تحریر کے بارے میں یہ وضاحت کی ہے:

" اس رسالے میں جو زبان اختیار کی گئی ہے وہ آج کل کی زبان اور اسلوب تحریر سے

علیحدہ ہے کہ میں پرانے مکتب کا طالب علم ہوں، بزرگوں کے حالات میں
نئی زبان مجھے پسند نہیں ہے کہ میری تربیت اس کو بے ادبی اور گستاخی سمجھتی ہے،
میں رح اور صلعم لکھنا بہت بُرا سمجھتا ہوں، اور اس کی جگہ رحمۃ اللہ، اور
صلی اللہ علیہ وسلم ہی میرے قلم سے نکلے گا۔"[1]

۷. **ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے**: حکیم صاحب کی ان تقریروں کا مجموعہ
ہے، جو انھوں نے ۱۹۴۵ء میں آل انڈیا ریڈیو ڈھاکہ سے نشر کی تھیں، آسودگان ڈھاکہ
کے پیش لفظ میں اس کتاب کی اشاعت کے بارے میں حکیم صاحب کا یہ خدشہ موجود ہے:

"ڈھاکہ ریڈیو نے یہ اقرار کر کے کہ وہ طبع کرا دیں گے، ۱۶ مقالے "ڈھاکہ
اب سے پچاس برس پہلے" مجھ سے لکھوائے اور پھر "کچھ پرانی باتیں" کے
عنوان سے ۲۰ مقالے پڑھوائے، پھر اسی وعدہ پر اور اسی طرح ڈھاکہ کی تاریخی
عمارات پر ۱۲ مقالے پڑھوائے، مگر ایفائے وعدہ کی امید نہیں، اگر مجھے خود
اجازت دے دیں تو طبع کراؤں گا، ان تینوں مقالے (مقالوں) میں ڈھاکہ
کے سابق حالات اتنے آگئے ہیں کہ ان کا چھپنا ضروری ہے، مگر جہاں برادرانِ
وطن مالک حل وعقد ہوں وہاں اس اسلامی شہر کی تاریخ پر کیا روشنی ڈالنے
کی امید کی جا سکتی ہے۔"[2]

مصنف کا خدشہ درست نہ نکلا، اور یہ کتاب نہ صرف ان کی وفات کے بعد
ریڈیو پاکستان ڈھاکہ نے شائع کی، بلکہ ۱۹۴۹ء میں کتاب منزل لاہور سے شیخ نیاز احمد نے
بھی اسے "ڈھاکہ پچاس برس پہلے" کے عنوان سے عام کیا اور اس پر خواجہ ناظم الدین

---

[1] آسودگان ڈھاکہ ص ۷، [2] ایضاً ص ۲۔

گورنر جنرل پاکستان سے تعارفِ مصنف لکھوایا، اس ایڈیشن میں سولہ عنوانات ہیں:
۱. ڈھاکہ تاریخ کی نظر میں ۲. ڈھاکے کی صنعت (ململ) ۳. ٹوپیوں کی کہانی،
۴. رمضان کی آمد آمد ۵. ڈھاکے کی روٹی ۶. پینے ۷. طعام داریاں ۸. ڈھاکے
کے مخصوص کھانے ۹. مشہور کھانے ۱۰. کشتی اور ورزش ۱۱. مٹھائیاں ۱۲. کھیلیں
۱۳. مشاغل موسیقانہ ۱۴. میلے ٹھیلے ۱۵. طبلہ اور گانے ۱۶. حقہ، پان، چائے۔
اس کتاب کا قلمی مسودہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں بشمارہ ۹۲ - H.R. موجود ہے، جو
ڈھاکہ ریڈیو کے محمد اعجاز حسین اعجاز مرادآبادی نے ۱۹۴۸ء میں نقل کیا تھا[1]

۸. **بیداری**: حکیم صاحب کا لکھا ہوا یہ ڈرامہ ۱۹۲۰ - ۱۹۲۴ء کے دوران
ڈھاکہ میں کھیلا گیا[2]

۹. **بیاضیں**: سید اقبال عظیم کو حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ان کی
دو بیاضیں دستیاب ہوئی تھیں، "ان بیاضوں میں الف سے شروع ہونے والی تمام
عربی، فارسی اور اردو کتابوں (جن کا اندراج "ثلاثہ غسالہ" میں ہوا ہے) کا ذکر کیا گیا ہے،
اور دوسری بیاض کے صفحات ہنوز سادہ ہیں"[3]

مگر ڈھاکہ یونیورسٹی کے ذخیرہ حبیب الرحمٰن میں نمبر HR - 62 کے تحت حکیم صاحب
کی ۲۰ صفحات پر مشتمل ایک اور بیاض موجود ہے، جس میں کچھ لطائف اور اسمائے مونث
و مذکر کی بحث درج ہے[4]

---

[1] فہرست مخطوطات ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری (۲ : ۱۰ - ۴۰۹) [2] رسالۂ اردو
شمارہ ۱، ۱۹۸۸ء، انجمن ترقی اردو کراچی ص ۲۱ - [3] مشرقی بنگال میں اردو
ص ۱۵ [4] فہرست مخطوطات کتب خانہ ڈھاکہ یونیورسٹی (۲ : ۴۷۲)

۱۰۔ مقالات: حکیم صاحب دو جرائد کے ایڈیٹر تھے، ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ سے المشرق نکلا، اور ۱۹۲۱ء میں جادو، المشرق ڈھاکے کا سب سے پہلا اردو رسالہ تھا، جو ہفتہ وار اخبار بن کر غروب ہوگیا، مگر جادو کوئی ڈھائی برس تک سر چڑھ کر بولا، حکیم صاحب اپنے رسالوں کے علاوہ برصغیر کے دیگر رسالوں میں بھی لکھتے رہتے تھے، مثلاً ماہنامہ ادیب الہ آباد بابت نومبر ۱۹۱۱ء میں ان کا مقالہ "شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" تصنیف مرزا جان طپش کے بارے میں شائع ہوا ہے[1]، ضرورت ہے کہ حکیم صاحب کے متفرق مقالات جمع کیے جائیں، مگر ان کی نشان دہی تب ہو جب رسائل کے مقالات کے اشاریے چھپیں، حکیم صاحب نے کئی اور رسائل عربی اور اردو میں لکھے جو چھپنے سے رہ گئے ہیں[2]

رموز الاخلاق عبدالکریم خاکی الاچی پوری کی فارسی تصنیف ہے اور خود انھی نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جس کا ذکر ثلاثۂ غسالہ میں آیا ہے، مگر سید اقبال عظیم نے یہ اردو ترجمہ حکیم صاحب سے منسوب کیا ہے جو درست نہیں ہے[3]۔

حکیم حبیب الرحمٰن کا نوادر خانہ حکیم صاحب کی دلچسپی صرف کتابوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ انھوں نے فرامین، کشمیری شالوں اور سکوں کا ایک نادر ذخیرہ بھی جمع کر رکھا تھا، اپنے کتب خانے کو انھوں نے زندگی بھر کی کمائی کہا ہے، اور یہ سچ ہے کہ بنگال کی تاریخ اور ثقافت سے متعلق جو مآخذ انھوں نے فراہم کیے تھے وہ کسی دوسرے ذاتی کتب خانے میں نہیں تھے، آسودگان ڈھاکہ اور ثلاثۂ غسالہ کا بیشتر مواد ان ہی کتابوں سے

---

۱ معارف میں بھی حکیم صاحب کے مقالات ... چھپتے تھے، ۲ آسودگان ڈھاکہ ص ۱۔۲
۳ مشرقی بنگال میں اردو ص ۱۱۳

حاصل کیا گیا ہے، حکیم صاحب نے وصیت کی تھی کہ ان کے نوادر ڈھاکہ یونیورسٹی میں محفوظ کر دیے جائیں، چنانچہ ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر عندلیب شادانی کی کوشش سے نوسو مخطوطات یونیورسٹی لائبریری میں منتقل ہوئے۔ اے۔ بی۔ ایم حبیب اللہ کی مرتبہ فہرست مخطوطات فارسی و اردو و عربی ڈھاکہ یونیورسٹی میں اپنے اپنے مقام پر ان کا ذکر ہوا ہے، اور اس کے لیے H.R کا مخفف استعمال کیا گیا ہے،

اسی طرح ان کے جمع کردہ سکے ڈھاکہ میوزیم چلے گئے، حکیم صاحب کے ذخیرہ سکوں کی فہرست N. K. Bhattasali نے انگریزی میں مرتب کی ہے جو ڈھاکہ سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہو چکی ہے۔

یہ تھا مختصر حال حکیم حبیب الرحمٰن مغفور کے علمی مشاغل کا، اب ہم اپنی توجہ زیر نظر کتاب "ثلاثۂ غسالہ" کی طرف مبذول کرتے ہیں۔

ثلاثۂ غسالہ "ثلاثۂ غسالہ" کتابوں کی کسی فہرست کے لیے عجیب و غریب سا عنوان ہے، مگر یہ اپنے محتویات کے حوالے سے بلا جواز نہیں ہے، کیونکہ اس میں بنگال میں تصنیف شدہ تین زبانوں (اردو، فارسی، عربی) کی کتابوں کا تذکرہ ہے، اور اگر ہم حافظ شیرازی کی معروف غزل کا مطلع:

ساقی حدیثِ سرو و گل و لالہ می رود ۔ ویں بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود

اور اس کا یہ بیت:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند ۔ ایں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

خاطر میں رکھیں تو حکیم صاحب کی نکتہ رسی سمجھ میں آجاتی ہے۔

حکیم صاحب کی عمر کا چھبیسواں سال تھا کہ ان کے ذہن میں ہندوستانی کتابوں کی

قاموس کی تیاری کا خیال گذرا، وہ خود تحریر کرتے ہیں:

"۱۹۰۶ء میں یہاں (ڈھاکہ) ایجوکیشنل کنفرنس کی تقریب سے متکلم اسلام علامہ شبلی مغفور تشریف لائے تو میں نے ان کی خدمت میں یہ خیال پیش کیا کہ حاجی خلیفہ کی کشف الظنون کی طرح صوبہ وار کتابوں کے حالات مع مصنفین کے مختصر تذکرہ کوئی لکھ دے تو ہندوستان کی یہ ایک بڑی علمی خدمت ہو، علامہ نے تحسین فرمانے کے ساتھ حکم دیا کہ بنگال کا حصہ تو پورا کرو۔"[1]

ایک طرف علامہ شبلی رحمہ اللہ کا حکم، دوسری طرف حکیم صاحب کا اپنا ذوق، حکیم صاحب نے تعمیل ارشاد اور تکمیل ذوق کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی اور کتابوں کے بارے میں معلومات کی فراہمی کے لیے ایک گشتی مراسلہ تیار کیا۔ ۔ ۔ اور اسے چھپوا کر مختلف لوگوں کے پاس بھیجا، یہ مراسلہ بہت معلوماتی اور مصنف کے اندازِ کار کا ترجمان ہے، اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"...... بنگال میں مسلمانوں نے پانسو برس سے زیادہ حکومت کی، اس لیے یہاں کے باشندوں نے کچھ نہ کچھ علمی آثار بھی چھوڑے ہیں، یعنی عربی، فارسی اور اردو زبان میں کتابیں اور رسائل تصنیف کیں، جن میں سے کچھ مطبوع ہوسکیں اور بہت کچھ قلمی رہ گئیں، اس کا ذخیرہ میں نہ صرف مسلمان ہی ہیں، بلکہ ہندو بھی شریک ہیں، اور ان کی تعداد بھی معقول ہے، مسلمانوں نے جب وہ زندہ تھے، تاریخ سے متعلق تمام شاخوں کی معقول خدمت کی، بلکہ واقعہ ہے کہ بہت سے تاریخی شعبوں کے دیگر علوم و فنون کی طرح وہ موجد و مخترع ہیں، چنانچہ

[1] آسودگان ڈھاکہ ص ۱۔

ابن الندیم کی کتاب الفہرست اس فن کی غالباً پہلی کتاب ہے، اور آج بھی اس کی قدر اسی قدر ہے جتنی تصنیف کے دن تھی، کتاب الفہرست کے تقریباً چھ سو برس بعد حاجی خلیفہ چلپی نے کشف الظنون نام سے ایک کتاب لکھی، جو معلومات، اسامی کتب اور حجم کے لحاظ سے بہت بڑی کتاب ہے، لیکن قدر وقیمت کی حیثیت سے کتاب الفہرست سے ادنیٰ، اس میں عربی، فارسی، ترکی زبان میں مسلمانوں نے ان کے زمانے تک جتنی کتابیں لکھی تھیں سب کی فہرست مع مختصر حال کے ہے، اس کے بعد مصر میں ایک عیسائی نے عربی زبان میں اکتفاء القنوع بما ھو المطبوع نامی ایک کتاب لکھی،[1] یہ گویا کشف الظنون کا تکملہ ہے اگرچہ اس کی خصوصیت دوسری ہے، کشف الظنون میں ہندوستان کی مصنفہ کتابوں کا ذکر بھی آیا ہے، لیکن ان کی تعداد برائے نام ہے، اس لیے بہت دنوں سے مجھے یہ خیال تھا کہ سارے ہندوستان کی عربی، فارسی، اردو کتابوں کی فہرست بن جاتی اور ساتھ ہی ساتھ مصنفین کا مختصر حال اور کتابوں کی کسی قدر تفصیل بھی لکھی جاتی تو اس طرح ہندوستان کی ایک علمی تاریخ مرتب ہو جاتی، اس خیال کو میں نے ۱۹۰۶ء میں علامہ شبلی مرحوم سے عرض کیا تھا، انھوں نے اسے بہت پسند کیا، لیکن کام کی وسعت دیکھ کر کامیابی کے متعلق شبہہ کا اظہار بھی فرمایا، میں نے اس وقت ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ پنجاب اور ممالک متحدہ کو

[1] اکتفاء القنوع بما ھو مطبوع من اشہر التالیف العربیۃ فی المطابع الشرقیۃ والغربیۃ۔ تالیف ایڈورڈ ونڈیک۔ تصحیح سید محمد علی البیلاوی، قاہرہ ۱۸۹۶ء، ۶۷۷ صفحات

الگ کرکے ہر یک صوبے کو ایک ایک فرد اپنے اپنے ذمے لے لے، اور
وہ اپنے اپنے صوبے کے فہرست مرتب کرے۔ پنجاب اور ممالک متحدہ
میں ایک ایک شہر یا ضلع ایک ایک شخص کے ذمہ ہوں تو یہ کام سہولت سے
ہو سکتا ہے، علامہ مرحوم نے یہ تجویز بہت ہی پسند فرمائی، اور میں نے اس وقت
سے اس کام کی داغ بیل ڈالی یعنی بنگال و آسام کو اپنے ذمے لیا اور تب ہی
سے مواد فراہم کرتا رہا، چنانچہ اب قریباً تین سو کتابیں عربی، فارسی اور اردو
میرے ذخیرے میں ہیں، یا ان کا حال مجھے معلوم ہے، اب صلائے عام
ہے یاران نکتہ داں کے لیے کہ آسام و بنگال کے اہل علم میری اتنی مدد کریں کہ
ان کی اطلاع میں اگر ان زبانوں کی کوئی کتاب مطبوعہ یا قلمی ہو تو اس کے متعلق
مجھے حسب ذیل امور کا جواب لکھ کر بھیج دیں، نہایت احسان مند ہوں گا، اور
ایک جلد مجوزہ کتاب بھی حاضر خدمت کروں گا:

نام کتاب، موضوع کتاب، نام مصنف، زبان، قلمی یا مطبوعہ، نام مطبع
سنہ تصنیف وطباعت، صفحات، مصنف کا مختصر حال اگر معلوم ہوں، اور
اور کتاب کی شروع سے ابتداء کی کئی سطر عبارت۔[1]"

یقیناً اس گشتی مراسلہ کے ذریعہ مصنف نے کچھ نہ کچھ مواد جمع کرلیا ہوگا، لیکن بعض
نہایت پڑھے لکھے لوگوں نے حکیم صاحب کو مایوس کیا، مثلاً انھیں دیوان علی کے شارح
شمس العلماء مولوی ولایت حسین کے حالات اور دیگر تصانیف کے کوائف درکار تھے'
الولد سر لأبیه کے مصداق شارح کے صاحبزادے شمس العلماء خان بہادر

[1] سہ ماہی دانش اسلام آباد شمارہ ۳، ص ۱۵۳-۱۵۴۔

ڈاکٹر ہدایت حسین سے بہتر کون ہوسکتا تھا، جو یہ معلومات فراہم کرتا، حکیم صاحب نے کئی
خطوط لکھے لیکن بقول حکیم صاحب "افسوس ہے کہ یہ اخلاف اسلاف کی یاد کرنا نہیں چاہتے
یعنی ڈاکٹر ہدایت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اسی طرح کنز السعادۃ کے مصنف مولوی محمد فاضل کا سال وفات مطلوب تھا، لیکن
ان کے وارث ان کا سال وفات، باوجود متواتر تقاضوں کے مجھے نہ بتلا سکے[1]"

ثلاثہ غسالہ میں مندرج معلومات کا عمدہ ترین ماخذ وہی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں
ہیں جو مصنف کے کتب خانے میں جمع تھیں، مصنف نے متعلقہ مقامات پر صراحت بھی
کردی ہے کہ یہ مخطوطہ ان کے پاس موجود ہے۔ بعد میں اس کی تائید اور تصدیق ڈھاکہ یونیورسٹی
میں مخطوطات کی فہرست سے بھی ہوجاتی ہے، جہاں اب ذخیرۂ حبیب الرحمٰن موجود ہے'
علاوہ ازیں حکیم صاحب نے مخطوطات کی فہرستوں، شعراء کے تذکروں اور ادب کی
تاریخوں سے بھی مدد لی ہے، جو ماخذ سامنے آئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ ارمغانی ۔ عبدالغفور نسّاخ کا چوتھا دیوان جو ۱۳۰۲ھ میں مرتب ہوا، اور
۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء میں مطبع نامی لکھنؤ سے طبع ہوا۔ حکیم صاحب نے "نظم معطّر" کی
طباعت کی اطلاع اس دیوان سے حاصل کی، کیونکہ اس میں متعدد معاصر کتابوں کے قطعات
تاریخ طباعت درج ہوئے ہیں۔

۲۔ تذکرۃ المعاصرین (فارسی) عبدالغفور نسّاخ۔

۳۔ سخن شعراء۔ (اردو) عبدالغفور نسّاخ۔

۴۔ گلدستۂ نتیجۂ سخن[2] ۵۔ گلزار اعظم ۶۔ گلزار خلیل

[1] ثلاثہ غسالہ، نسخۂ جامعہ ڈھاکہ [2] نتیجۂ سخن اردو کا مشہور گلدستہ تھا، جسے کلکتہ سے

(بقیہ ص ۱۸۲ پر)

ان کتابوں کے علاوہ مختلف کتب خانوں کی انگریزی میں طبع شدہ فہرست مخطوطات بھی حکیم صاحب مرحوم کے پیش نظر تھیں:

۷۔ فہرست کتب خانہ شاہانِ اودھ مرتبہ اشپرنگر کلکتہ ۱۸۵۴ء بزبان انگریزی

۸۔ فہرست مخطوطات فارسی بہار لائبریری جلد اول مرتبہ قاسم حصیر رضوی، و عبدالمقتدر، کلکتہ ۱۹۲۱ء، جلد دوم مرتبہ ہدایت حسین، کلکتہ ۱۹۲۳ء۔

۹۔ فہرست مخطوطات عربی و فارسی، کتب خانہ خدا بخش، مرتبہ عبدالمقتدر۔

۱۰۔ فہرست مخطوطات فارسی، انڈیا آفس لائبریری، مرتبہ ہرمن ایتھے جلد اول، لندن ۱۹۰۳ء، جلد دوم ۱۹۳۷ء۔

۱۱۔ تاریخ ادب اردو، از رام بابو سکسینہ، الہ آباد، ۱۹۲۷ء۔

۱۲۔ مصنف نے بعض اردو مخطوطات کی نشان دہی انڈیا آفس لائبریری لندن میں کی ہے، ظاہراً معارف کا وہ مضمون ان کے پیش نظر تھا جو علامہ سید سلیمان ندویؒ نے انگلستان سے واپسی کے بعد کتب خانۂ وزارت ہند لندن پر لکھا تھا، اور جس میں وہاں کے اہم اردو مخطوطات کی فہرست شائع کی تھی۔

محتویات ثلاثۂ غسالہ

ثلاثۂ غسالہ کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ اس پر

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) منشی محمد وزیر وزیر عظیم آبادی (شاگرد حکیم سجاد موہانی) شائع کرتے تھے، اس کا پہلا شمارہ فروری ۱۸۸۱ء میں نکلا تھا، اور جنوری ۱۸۸۶ء کے بعد تک نکلتا رہا، اس میں اردو، فارسی کا طرحی اور غیر طرحی کلام شائع ہوا کرتا تھا، اس گلدستے پر حسرت موہانی (اردوئے معلی جنوری اپریل ۱۹۱۲ء) حکیم حبیب الرحمن (معیار جولائی، اگست ۱۹۳۶ء) اور پروفیسر مختار الدین احمد (جدید اردو، کلکتہ ۱۹۴۰ء) کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔

"چالیس برس سے کچھ نہ کچھ کرتا رہا ہوں، مگر مسلسل کام نہیں ہوتا، تاہم اب (یعنی ۱۹۴۶ء میں) کام ختم ہو چکا ہے، ممکن ہے کہ وہ بھی اب کے چھپ جائے کہ بنگال و آسام کی علمی تاریخ ہے' اور میرے چہل سالہ جد و جہد کا نتیجہ"[1]

ثلاثۂ غسالہ کو بنگال و آسام کی علمی تاریخ کہنے کی بجائے علمی تاریخ کا ماخذ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

کسی تصنیف کے لیے چالیس (۴۰) سال کا عرصہ کافی ہوتا ہے، اگر ہمارا مصنف جم کر کام کرتا تو وہ اس مدت میں بہتر نتائج حاصل کر سکتا تھا، میرے خیال میں مصنف کی متنوع دلچسپیاں، گونہ گوں مصروفیات، ماخذ کی کمی اور لوگوں کی طرف سے تعاون میں سرد مہری کی وجہ سے بہت کچھ اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے، بایں ہمہ اس وقت ثلاثۂ غسالہ میں بنگال (یعنی مصنف کے وقت کا مشرقی بنگال ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کا مشرقی پاکستان اور مابعد عرصے سے اب تک بنگلادیش، اور موجودہ بھارتی ریاستوں مغربی بنگال اور آسام) میں تصنیف ہونے والی ۲۰۴ اردو — ۱۸۱ فارسی اور ۳۷ عربی تصانیف اور ان کے مصنفوں کا تذکرہ موجود ہے، البتہ بعض ایسی کتابوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو غیر بنگالی مصنفین کی بنگال کے بارے میں ہیں، جب ہم ثلاثۂ غسالہ کو "بنگال میں تصنیف شدہ کتب کی کتابیات" کہتے ہیں تو اس سے یہ ابہام دور ہو جانا چاہیے کہ

(الف: یہ صرف بنگالی مصنفین کی کتابوں کی کتابیات نہیں ہے، بلکہ اس میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو کسی غیر بنگالی مصنف نے بنگال کے قیام یا سفر بنگال کے دوران تصنیف کی ہیں،

[1] آسودگان ڈھاکہ ص ۲۔

ب ۔ یہ بنگال میں موجود مطبوعات یا مخطوطات کی فہرست نہیں ہے، وہ ایک الگ موضوع ہے۔

ثلاثۂ غسالہ زیادہ تر تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری / انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کی تصانیف کا احاطہ کرتی ہے، اس سے قدیم تر کتابوں کا بہت کم تذکرہ ہوا ہے، مصنف نے اپنے معاصرین کی کتابوں اور ان کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ بنگال کی تہذیب کا منظر سامنے آجاتا ہے، بنگال میں جاری مذہبی مناقشوں، ادبی معرکوں، ثقافتی روایتوں اور بزرگوں کی اخلاقی قدروں کے بارے میں کئی نکتے مل جاتے ہیں۔

مصنف نے دستیاب کتابوں پر اپنا تبصرہ بھی لکھا ہے، بعض تبصرے سادہ ہیں، اور بعض میں حقِ تنقید بھی ادا کیا گیا ہے۔

ان سب باتوں نے اور مصنف کے بے تکلف طرزِ تحریر نے ثلاثۂ غسالہ کو ایک خشک کتابیات کے بجائے ایک دلچسپ علمی اور تہذیبی دستاویز بنا دیا ہے۔

یہ کتاب ایک اور اعتبار سے بھی اہم ہے، یعنی مصنف کے اپنے حالات کے لیے اس سے مدد لی جا سکتی ہے، بطور خاص معاصر مصنفین اور بزرگوں سے تعلقات کے بارے میں متعدد اشارات موجود ہیں، صرف اردو حصے میں احسن، انشائے حمید، بس کا روکھا، بیمار بلبل، تحفۃ الطالبین، رکنِ عظیم، سوز ابد، گلزار نعت، مجموعۂ نقلیات، مختصر الاشتقاق، شفقت برادری اور مفید القاری کے مصنفوں کے ساتھ حکیم صاحب کے تعلق خاطر کا پتہ چلتا ہے۔

کیا ثلاثۂ غسالہ کا مکمل متن موجود ہے؟ ثلاثۂ غسالہ کی عکسی نقل دیکھنے کے بعد کئی بار یہ سوال میرے

سامنے آتا رہا کہ کیا یہ ثلاثۂ غسالہ کا مکمل متن ہے؟ وہ اس لیے کہ بعض اندراجات میں حکیم حبیب الرحمٰن صاحب نے لکھا ہے کہ اس مصنف کا حال میں نے اسی کتاب میں فلاں جگہ لکھا ہے، مگر ورق گردانی کے بعد پتہ چلا کہ جس اندراج کا حوالہ دیا گیا ہے وہ موجود نہیں ہے، اس سے یہ شبہہ تقویت پاتا ہے کہ ثلاثۂ غسالہ اس مکمل حالت میں ہم تک نہیں پہونچی جس حالت میں مرحوم مصنف نے اسے چھوڑا تھا۔

مصنف کی وفات سے کوئی چار ماہ پہلے اکتوبر ۱۹۴۶ء تک یہ مسودہ طباعت کے لیے تیار تھا، وہ اس انتظار میں تھے کہ مساجد ڈھاکہ پر ان کا رسالہ پہلے چھپ جائے اور ان کی صحت بہتر ہو جائے تو ثلاثۂ غسالہ کو مطبع میں بھیجا جائے، مگر صحت ایسی بگڑی کہ نہ مساجد ڈھاکہ چھپ سکی اور نہ ثلاثۂ غسالہ کی اشاعت کی باری آ سکی، بلکہ فرشتۂ اجل حکیم صاحب کی وفات کا پیغام لے کر آ گیا، حکیم صاحب کی وصیت کے مطابق ان کے مسودات ڈھاکہ یونیورسٹی میں محفوظ ہونا تھے، مگر ہوا کیا؟ اس کی روداد ۱۹۵۴ء میں ثلاثۂ غسالہ سے استفادہ کرنے والے سید اقبال عظیم صاحب سے سنیئے:

"ثلاثۂ غسالہ کے حصۂ اردو سے متعلق جو دستاویزات اس وقت میرے پاس ہیں ان کی شکل یہ ہے کہ ہر کتاب کے متعلق فل اسکیپ سائز کے کاغذ پر حکیم صاحب نے مفصل نوٹ اور نمونۂ عبارت درج کر کے انھیں حروف تہجی کے اعتبار سے سلسلہ وار مرتب کیا ہے، تینوں زبانوں پر مشتمل کاغذات جن کی تعداد کئی ہزار ہے اور وزن میں کم و بیش ایک من ہیں، ایک گٹھری کی شکل میں دستیاب ہوئے، جن میں دو بیاضیں بھی برآمد ہوئیں، ان بیاضوں میں الف سے شروع ہونے والی تمام عربی، فارسی اور اردو کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور دوسری بیاض کے آخری

صفحات ہنوز سادہ ہیں، ..... حکیم صاحب کے یہ مسودات مجھ تک کس طرح پہونچے، ایک طویل و عبرتناک داستان ہے جس کا بیان رفع شر کی خاطر نہیں کرنا چاہتا۔ قصہ مختصر یہ کہ ثلاثۂ غسالہ کا حصۂ اردو اب میری ملکیت ہے اور جائز ملکیت ہے، اس لیے کہ میں نے نہ صرف اس کی مکمل قیمت ادا کی ہے، بلکہ اب تک ادا کر رہا ہوں، اور اس وقت تک ادا کرتا رہوں گا جب تک میرا "قرض خواہ" زندہ و سلامت ہے۔[۱]"

اقبال عظیم صاحب کے منقولہ بیان میں کئی باتیں معنی خیز ہیں، انھوں نے ثلاثۂ غسالہ کے کاغذات کی تعداد "کئی ہزار" اور وزن "کم و بیش من" اور حجم "ایک گٹھڑی" بتایا ہے، جبکہ ۱۹۸۵ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایک باخبر شخص نے یونیورسٹی میں موجود ثلاثۂ غسالہ کے مسودات کے صفحات کی کل تعداد ۵۵۰ بتائی ہے، اس میں بھی صفحات ۴۵۳ تا ۴۸۸ ثلاثۂ غسالہ سے متعلق نہیں ہیں، مجھے ان ہی پانچ سو پچاس صفحات کی عکسی و دستی نقل موصول ہوئی ہے اور اس کا وزن دو کلوگرام سے کسی طرح بھی زیادہ نہیں، اور یہ کاغذات بڑی آسانی سے ایک فائل کور میں سما سکتے ہیں ــــــ اب یہ ہزاروں صفحات کہاں گئے؟ اس کا یقینی جواب دینا مشکل ہے، بہرحال جب اقبال عظیم صاحب اس تاریخی دستاویز سے پوری طرح استفادہ کر چکے اور سقوط ڈھاکہ (۱۹۷۱ء) کے بعد پاکستان آنے لگے تو ثلاثۂ غسالہ کے اوراق حکیم حبیب الرحمن مرحوم کے بڑے بیٹے حسام الدین صاحب کو پہونچا گئے، جنھوں نے ۱۹۷۹ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے سپرد کر دیے، جہاں اب یہ شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہیں ــــــ ثلاثۂ غسالہ کی داخلی شہادتوں اور مذکورہ واقعہ کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ اس قیمتی علمی سرمایے کے بہت سے اوراق ضائع ہو گئے ہیں، بہرحال جو ثلاثۂ غسالہ کا دستیاب متن (متعلق بہ کتب اردو، فارسی، عربی) میں نے مرتب کر لیا ہے اور اس پر تعلیقات کا اضافہ کر دیا ہے، یہ اب اشاعت کے لیے تیار ہے۔

[۱] مشرقی بنگال میں اردو، ص ۱۴ - ۱۵۔

دینی تعلیم کے نصاب اور عربی مدارس کے سلسلے میں

بعض قابل غور باتیں[۱]

از: ضیاء الدین اصلاحی

نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہر قوم کے لیے تعلیم کا مسئلہ بڑا اہم اور ضروری ہوتا ہے، افراد کی تعمیر و تشکیل اور قوموں کی نشو و نما اور ترقی میں مناسب اور بہتر تعلیم و تربیت کو بڑا دخل ہوتا ہے اسی سانچہ میں وہ افراد ڈھل کر تیار ہوتے ہیں جن کی قوم کو ضرورت ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ ان کی ذہنیت اور ان کے مزاج کو بنایا اور بگاڑا جاتا ہے، اس لیے تعلیم کے مسئلہ کے حل اور اس کے بہتر نظم و بند و بست ہی پر آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کی بقا و ترقی کا دار و مدار ہے جو گذشتہ بیالیس[۴۲] برس سے مسلسل کشمکش و اضطراب کے دور سے گزر رہے ہیں اور گوناگوں پیچ در پیچ مسائل میں الجھے ہوئے ہیں، ہر صبح ان کے لیے نت نئے حوادث لے کر نمودار ہوتی ہے اور ہر شام کسی نئی اور تازہ مصیبت کا پیش خیمہ ہوتی ہے، کبھی ترکی کو یورپ کا "مرد بیمار" کہا جاتا تھا مگر آج ہندوستان کا "مرد بیمار" مسلمان ہے جو تعلیمی اعتبار سے نہایت پس ماندہ اور پست ہے، اکثر مسلمان والدین اپنے بچوں کو اسکول بھیجنا گوارا نہیں کرتے اور وہ انہیں بچپن ہی سے ایسے مشاغل میں لگا دیتے ہیں جن سے

[۱] یہ مقالہ جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں کی تعلیمی کانفرس منعقدہ ۲ تا ۴ فروری ۱۹۹۰ء کو پڑھا گیا۔

ان کے خیال میں وہ کھانے کمانے کے لائق ہوجائیں، جو والدین بچوں کو اسکول بھیجتے ہیں وہ جلد از جلد اس سے ان کا تعلق منقطع کرانے کی فکر میں رہتے ہیں، عربی مدارس میں تعلیم دلانے کو وہ فضول اور باعث ننگ سمجھتے ہیں، یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جو لوگ بچوں کی دنیوی تعلیم پر بے دریغ روپیے خرچ کرتے ہیں وہ اس کا عشر عشیر بھی دینی تعلیم پر خرچ نہیں کرتے، اسلیے کہ ان کی نگاہ میں اُس دین کی کوئی قدر وقیمت باقی نہیں رہ گئی ہے جس نے ان کو عزت وسرفرازی عطا کی تھی اس لیے وہ اپنے بچوں کو وہی تعلیم دلانا پسند کرتے ہیں جس کے وسیلہ سے انہیں نوکری مل جائے اور وہ اپنا پیٹ پال سکیں، خواہ اس سے ان کا دینی وملی تشخص برقرار رہے یا نہ رہے، اس سے بڑھ کر ہمارے قومی اعمال وخصائص کا بگاڑ اور اس سے زیادہ ہمارے فکر ونظر کا فساد اور کیا ہوسکتا ہے؟

مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے مسئلہ سے اور زیادہ غافل ہیں، ان کے اس طرز عمل اور تعلیم سے بے پروائی نے انکی موجودہ نسل کو تباہی کے غار عمیق میں پہنچا دیا ہے۔

مسلمانوں کی ساری بیماریوں، کمزوریوں اور پس ماندگیوں کا علاج صرف علم ہے جس پر اسلام کی بنیاد ہے، قرآن مجید کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیتوں میں اسی کا ذکر ہے اور قرآن مجید کے حامل نے اپنی ہدایت سے یہ ثابت کردیا ہے کہ مسلمان کو مہد سے لحد تک اسی کے لیے سرگرداں رہنا چاہیے علم وتعلیم کی دینی اہمیت وضرورت پر بہت لکھا جا چکا ہے، اس لیے اس پر مزید بحث وگفتگو کے بجائے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آج بھی اگر مسلمان علم کو اپنی گرفت میں لے لیں تو تاریکی، مایوسی اور پس ماندگی کے بادل چھٹ سکتے ہیں، کیونکہ علم ایک طاقت ہے اور افراد و اقوام علم وآگہی کی بدولت طاقتور اور توانا ہوتے ہیں، اوائل اسلام میں علم حاصل کرکے مسلمانوں نے ساری دنیا کو مسخر

کرلیا تھا مگر موجودہ دور میں اس سے محروم ہونے کی بنا پر انہیں ہر قسم کی ذلت ونکبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، آج یورپ علم ودانش میں برتری کی وجہ سے دنیا میں ہر طرف اپنا سکہ جمائے ہوئے ہے اور دنیا کی دوسری قومیں بھی اسی کی بدولت عروج وکامرانی کی منزلیں طے کر رہی ہیں مگر مسلمان روز بروز پست اور بدحال ہوتے جا رہے ہیں ؎

چکور اور شہباز سب اوج پر ہیں   مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال وپر ہیں

اس وقت ایک طرف ہمارے سامنے موجودہ تعلیمی ڈھانچہ ہے، جو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو راس نہیں آرہا ہے اور ان کے قد وقامت پر فٹ نہیں ہو رہا ہے بلکہ ان کے اصل امتیازات وتشخصات سے بھی دستبردار کرنے والا ہے جس کو اختیار کرنے سے دین وایمان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے لیکن سردست اس پر بحث مقصود نہیں ہے، یہاں ہم کو دینی درسگاہوں کے نصاب کے متعلق اظہار خیال کرنا ہے جس نے مسلمانوں کو روح عصر سے بیگانہ اور اپنے ماحول اور ملک میں اجنبی بنا دیا ہے اس سے ان کی دنیا ہی نہیں جاتی بلکہ وہ جس علم نبوت کے وارث وامین ہیں اور جس کی دنیا میں تبلیغ واشاعت پر مامور ہیں اس کو نہ انجام دے رہے ہیں اور نہ اس کے تقاضوں کو پورا کر پا رہے ہیں۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ زمانہ سدا ایک حالت پر نہیں رہتا اس کا ہر دن اپنے ساتھ نئے تغیرات وحوادث لاتا ہے، سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی سے روز آنہ نت نئے انکشافات سامنے آرہے ہیں اور نئی نئی ایجادات ہو رہی ہیں، جنکا اس سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا مگر اسلام ایک ابدی اور مکمل دین ہے، اس پر کوئی انقلاب وتغیر اثر انداز نہیں ہوسکتا اور وہ ابدالآباد تک انسان کی رہنمائی کرتا رہے گا، کیونکہ اس کے اندر لچک اور نمو ہے اور وہ نئے حالات ومسائل سے عہدہ برآ ہونے کی پوری

صلاحیت رکھتا ہے، ماضی میں بھی اس نے نئے اور پیچیدہ حالات کا سامنا کیا ہے اور مستقبل میں بھی وہ نئے حالات کا سامنا کرنے اور آیندہ کی ضرورتوں اور دشواریوں میں رہنمائی کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

قرآن مجید نے جا بجا تفکر و تعقل کی دعوت دی ہے، اس کا حامل بھی فکر و نظر کی دعوت دینے والا بہترین معلم تھا جو عقل انسانی کی تربیت کرتا تھا اور اس کو اکتساب حکمت کے لائق بناتا تھا تاکہ وہ دشواریوں اور مشکلات سے پریشان، ہراساں اور مایوس نہ ہو مگر بدقسمتی سے مسلمانوں کے صدیوں کے جمود و تعطل اور ان میں ہمہ گیر تقلید کے رواج سے یہ خیال رچ بس گیا ہے کہ العیاذ باللہ اب اسلام میں رہنمائی اور زمانہ کے حالات اور تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی،

مسلمانوں کا یہی جمود و تعطل دینی مدارس کے نصاب میں ترمیم و اصلاح اور طریقہ تعلیم کے رد و بدل میں مانع ہو رہا ہے حالانکہ جب زمانہ ایک حال پر قائم نہیں رہتا اور ہر عہد کا ایک خاص مذاق و مزاج ہوتا ہے جس کے اور رفتار زمانہ کے ساتھ دنیا کی چیزیں بھی بدلتی رہتی ہیں اور جو چیزیں اس رفتار اور تغیر کا ساتھ نہیں دیتیں یا اپنے کو اس کے ہم آہنگ نہیں بناتیں وہ یا تو بالکل مٹ جاتی ہیں یا ان کا زوال و انحطاط شروع ہو جاتا ہے لیکن اسلام کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایک ابدی اور لازوال مذہب ہے جو ہر لحاظ سے مکمل اور ہمہ گیر ہے، اس لیے اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں ہو سکتا، اس کی معنویت اور تازگی ہمیشہ برقرار رہے گی مگر جہاں تک دینی تعلیم کے نصاب و نہج کا تعلق ہے اس میں ہر دور کے حالات کے لحاظ سے رد و بدل ہوتا رہے گا، اس کے کسی خاص طریقہ اور مخصوص طرز پر اصرار کرنا اور اس کو وحی الٰہی کی طرح غیر مبدل سمجھنا غلط ہے۔

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا ۔۔۔ منزل یہی کٹھن ہے، قوموں کی زندگی میں

اس زمانہ میں نصاب تعلیم میں تبدیلیاں ناگزیر ہو گئی ہیں اور علوم اسلامی کی تحصیل و اکتساب کا جو طریقہ و انداز گذشتہ زمانے میں رائج تھا وہ اس وقت کے لحاظ سے یقیناً مفید اور بہتر رہا ہوگا مگر اب جب وہ مفید نہیں رہا تو اس کو بدل دینے میں نہ کوئی وقت ہے اور نہ قباحت، بلکہ تبدیل کرنا ہی مفید اور وقت و حالات کا عین اقتضا ہے۔

البتہ یہ حقیقت ضرور پیش نظر رہنی چاہیے کہ اصل مقصد دین و ایمان کی سلامتی، تہذیبی و اخلاقی قدروں کا تحفظ اور مذہب کی خدمت و اشاعت ہے، اس لیے دین و مذہب یا ان چیزوں کو جن پر اس کا اصلی دار و مدار ہے کسی حال میں نہ ترک کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی تبدیلی کی جا سکتی ہے، بایں ہمہ زمانے کے حالات اور تقاضوں سے بھی آنکھیں بند نہیں کی جا سکتی ہے، کیونکہ ان کو نظر انداز کرنے سے ہمارے قومی و ملی وجود کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

ماضی میں مسلمانوں کو جب اس طرح کے حالات پیش آئے تو ان کے مصلحین، مفکرین اور ماہرین تعلیم مدارس کے نصاب میں اصلاح و تغیر کرتے رہے، عباسی حکومت کے عہد میں یونانی علوم و فنون کی یلغار کے نتیجہ میں الحاد و بے دینی کا سیلاب امنڈ پڑا تھا اور مذہب میں تشکیک و اوہام کی وبا پھیل گئی تھی، اس کو روکنے کے لیے اسلامی علوم و آداب میں بھی اصلاح کی ضرورت محسوس کی گئی اور مسلمانوں کے ایک گروہ نے خود یونانی علوم و فنون میں مہارت اور دسترس پیدا کر کے ان کا رد کیا تھا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اپنے زمانہ کے نصاب کی خامیوں کا جائزہ لے کر ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائی ہیں، انھوں نے شرعی علوم کا ایک مختصر اور نیا نصاب بھی

تیار کیا اور اپنے زمانہ کے علما کو ان فنون کی تحصیل کی پر زور دعوت دی، جو زمانے اور حالات کا مقتضا تھے، مولانا شبلیؒ نے الغزالی میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ امام صاحب کی اصلاح کا یہ نتیجہ نکلا کہ

"تعلیم کے نصاب میں فقہ و کلام کے ساتھ منطق و فلسفہ داخل ہوگیا، دنیوی علوم کے لیے اتنا کافی وقت نکل آیا کہ فقہا و محدثین بھی ریاضی داں اور حساب داں ہونے لگے، فقہ میں سے علم الخلافیات کا حصہ بالکل خارج ہوگیا، کلام کے بہت سے غیر ضروری مباحث چھٹ گئے"[1]

آٹھویں صدی میں علامہ ابن خلدون نے اپنے عہد کے نصاب و نظام تعلیم میں متعدد اصلاحات کی ہیں، ان کو نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا اس لیے ذیل میں انکی بحث کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے

"متداول علوم کی دو قسمیں ہیں، ایک مقصود بالذات ہیں جیسے تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، طبیعیات، الٰہیات اور ایک وہ ہیں جو انکے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں جیسے قواعد عربی حساب، منطق پس جو علوم مقصود بالذات ہیں اگر ان میں کلام کو وسعت دیجائے تو کوئی حرج نہیں لیکن جو علوم دوسرے علوم کا آلہ ہیں جیسے قواعد عربی اور منطق وغیرہ تو انکو صرف اسی حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ وہ آلہ ہیں اس لیے ان میں کلام کو وسعت نہ دینی چاہیے کیونکہ اس سے ان کا اصل مقصد فوت ہوجائیگا اسی طریقہ سے طالب علم کی عمران سب کی تحصیل کے لیے کافی نہ ہوگی کیونکہ ان علوم آلیہ کی مصروفیت میں عمر ضایع ہو جائے گی جیسا کہ متاخرین نے نحو، منطق اور اصول فقہ کے متعلق کیا ہے"، (مقدمہ ابن خلدون صـ ۶۱۵)

امام غزالیؒ، علامہ ابن خلدون اور بعض دوسرے علماء نے اپنے عہد کی جن خامیوں کی جانب توجہ دلائی تھی وہ ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں میں باقی رہیں، طلبہ کی عمر

---

[1] الغزالی صـ ۱۸۸ ۱۹۵۶ء

علوم آلیہ ہی کی تحصیل میں رائگاں ہوجاتی تھی اور شرعی علوم قرآن، حدیث اور نقد رجال وغیرہ پر برائے نام توجہ دی جاتی تھی، فقہ و کلام سے اشتغال اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ سارا زور خلافیات پر ہی دیا جاتا تھا، جدید علوم سے نفرت کی جاتی تھی، ان ہی حالات میں آج سے تقریباً ۱۰۰ برس قبل نصاب تعلیم میں اصلاح کی انقلاب انگیز صدا مجلس ندوۃ العلماء نے اس زور و شور سے بلند کی کہ ہندوستان ہی نہیں پوری اسلامی دنیا میں اس کی گونج سنائی دینے لگی، مجلس کی توجہ خصوصیت سے ان سہ گانہ مسائل پر مرکوز رہی۔

۱۔ نصاب تعلیم کی اصلاح ۲۔ باہمی فرقہ وارانہ اختلافات اور ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کو روکنا ۳۔ بقدر ضرورت دینی علوم کے ساتھ نئے فنون کی تعلیم دینا،

اس مجلس کے رکن اعظم حجۃ الاسلام علامہ شبلیؒ تھے انھوں نے اپنے فکر انگیز مضامین اور تحریروں سے مجلس ندوۃ العلماء کی تحریک کو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا اور خود ایک نیا نصاب تعلیم بھی وضع کیا۔ مجلس نے دار العلوم ندوۃ العلما کی داغ بیل اسی لیے ڈالی تھی کہ ان اصولوں کو عملاً برتا جائے اور ان کے بموجب تعلیم کا صحیح طریقہ رائج ہو، الحمد للہ کہ اس کی کوششیں رائگاں نہ گئیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جو حالات تھے اب ان میں بھی بڑا تغیر و تبدل ہوگیا ہے، خصوصاً آزادی کے بعد جو حالات پیدا ہوگئے ہیں اور موجودہ دور میں صنعت و حرفت کے فروغ کے باعث سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی اہمیت و برتری نے جو مسائل پیدا کر دیے ہیں، ان کے بعد بھی اگر مذہبی درسگاہوں میں وہی نصاب تعلیم جاری رہا تو یہ ایک ملی اور قومی جرم اور ایسا زیاں ہوگا جس کی تلافی ممکن نہ ہوگی ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے ۔۔۔ کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس وقت بڑی سنجیدگی سے عربی مدارس کے لیے

ایک جدید نصاب اور نئے نظام تعلیم و تربیت کے بارے میں غور کرنا ضروری ہوگیا ہے تاکہ ان کی درسگاہیں بانجھ ہو کر نہ رہ جائیں، بلکہ ان سے ایسے علماء و فضلا نکلیں جو دینی علوم کے ماہر بھی ہوں اور جدید علوم سے آشنا بھی، ان کے ایک ہاتھ میں جام شریعت اور دوسرے میں سندان عشق ہو تاکہ وہ ملک و ملت کی صحیح رہبری اور قیادت کرسکیں اور موجودہ فضا اور نئے ماحول میں گھٹن نہ محسوس کریں بلکہ اسلام کی دعوت کو عصری تقاضوں کے مطابق پیش کرسکیں۔

اس ترقی اور مسابقت کے دور میں مسلمانوں کے لیے دینی علوم کے ساتھ جدید اور عصری تعلیم کا حصول ضروری ہوگیا ہے یعنی کتاب و سنت کے علم کے ساتھ ہی سائنس، ٹکنالوجی، میڈیسین ریاضی، انگریزی، فلسفہ جدیدہ، معاشیات، سیاسیات، نفسیات، تاریخ، جغرافیہ، عمرانیات اور اپنے ملک کی زبان ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں کی تحصیل بھی کرنی ہوگی، ان میں حصول کمال کے بغیر ان کا شمار ملک کی ترقی یافتہ قوموں میں نہیں ہوسکتا، دینی علوم حاصل کرکے اپنی عاقبت سنوارنی چاہیے اور نئے علوم میں دسترس پیدا کرکے انہیں اپنی دنیا کو بنانا چاہیے قرآن مجید نے دونوں جہاں میں بھلائی اور خیر حاصل کرنے کی تلقین کی ہے، ہر مسلمان روزآنہ پانچوں وقت کی نماز کے بعد یہ دعا کرتا ہے:۔

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ — خداوندا تو ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے

فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (بقرہ ۲۰۱) — اور آخرت میں بھی،

اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے مگر یورپ کے سیاسی تسلط اور مغربی افکار و علوم کی بالادستی نے جہاں اور فتنے پیدا کیے ہیں وہاں دین و دنیا کی تقسیم کا فتنہ بھی بپا کیا ہے جس کے نتیجہ میں علوم و مدارس کی بھی دو قسمیں ہوگئی ہیں، چنانچہ عربی مدارس اور جدید علوم کے ادارے ایک دوسرے کے حریف اور متوازی سمجھے جاتے ہیں جن میں مستقل کشمکش اور مسلسل آویزش

جاری رہتی ہے، علوم و مدارس کی اس تقسیم اور ان کی دوئی کو ختم کرکے اب ان میں وحدت و اتصال پیدا کرنا چاہیے تاکہ قدیم زمانہ کی طرح اسلامی درسگاہوں سے بیک وقت جابر بن حیان، فارابی، ابن ہیثم، بوعلی سینا اور البیرونی جیسے سائنس داں اور امام غزالی، ابن رشد، رازی، حافظ ابن تیمیہ اور علامہ ابن خلدون جیسے متبحر علماء و فضلا آج بھی پیدا ہوں۔

موانع اور دشواریاں اور ان کا حل

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ موجودہ دور کے حالات و ضروریات کا یہ عین تقاضا ہے کہ مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کرکے انگریزی، ہندی، سائنس اور حساب کو اس کا ضروری جز بنا دیا جائے اور حسب گنجائش دوسرے نئے علوم کا اضافہ بھی کیا جائے اور اسلامی تاریخ کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ظاہر ہے اس نئے نصاب کی راہ میں بعض مشکلات اور دشواریاں پیش آئیں گی لیکن اگر واقعی ملک و قوم کا مفاد اور دنیا و آخرت کی بھلائی اور مسلمانوں کی خیر خواہی پیش نظر ہے تو ان موانع اور رکاوٹوں کو دور کرنا اور اندیشوں اور وسوسوں کو دل سے نکالنا ہوگا، تقلید کی بندش اور جمود و تعطل کے روگ سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا جس کی وجہ سے ملت مرحومہ کا یہ حال ہوگیا ہے کہ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

نصاب کو بدلنے میں اس وقت جو خدشات اور موانع لاحق ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ دینی درسگاہوں کے پاس وسائل و ذرائع کی کمی ہے، مذکورہ مضامین پڑھانے والے استاذوں کو بڑی تنخواہیں دینی ہوں گی اگر وسائل مہیا بھی ہوجائیں تو ایک ہی درسگاہ میں تنخواہوں کا دوہرا معیار کسی طرح مناسب نہیں ہے، ایک ہی مدرسہ میں تنخواہوں کے اعتبار سے دو قسم کے استاذوں کے تقرر اور موجودگی سے نئے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔

۲- عربی مدرسوں کا نصاب پہلے ہی سے بھاری ہے، اس میں نئے مضامین شامل کرنے سے مزید بوجھ بڑھے گا جس کے نہ طلبہ متحمل ہوں گے اور نہ اساتذہ اتنی محنت کر سکیں گے، منتظمین کی الجھنیں اور پریشانیاں بھی بڑھیں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قدیم وجدید دونوں طرح کے علوم پڑھانے کے لیے وقت کہاں سے آئے گا۔

یہ اور اس طرح کی دوسری دقتیں اس لیے پیش آرہی ہیں کہ مسلمانوں میں بہت زیادہ تن آسانی اور سہولت پسندی آگئی ہے اور وہ محنت ومشقت کے خوگر نہیں رہ گئے ہیں، ان کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ کمزور، پس ماندہ اور علم میں کم مایہ اقلیت کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کو اکثریت اور طاقتور گروہوں سے زیادہ محنت ومشقت کرنی پڑے گی، تب ہی انکی قومی وملی ساکھ باقی رہ سکتی ہے اس لیے مسلمان طلبہ، اساتذہ اور منتظمین ہر ایک کو محنت وجفاکشی کا عادی اور مزید بوجھ اٹھانا پڑے گا اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔

جہاں تک نصاب میں گراں باری کا تعلق ہے اس کو دور کرنے کے لیے نصاب میں شامل غیر ضروری اور غیر مفید مضامین کو کم کیا جاسکتا ہے یا جن علوم آلیہ کی تحصیل پر زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے ان پر کم وقت صرف کیا جائے، تنخواہوں کے دوہرے معیار اور اس طرح کے وقتی وہنگامی مسائل کو حل کرنے کے لیے مقامی طور پر تعلیمی بورڈ اور انجمنیں قائم کی جاسکتی ہیں جو اس طرح کے مسائل کو اجتماعی وسائل اور باہمی رائے ومشورہ اور تعاون سے حل کر سکتی ہیں۔

دراصل مسلمانوں کا ایک خاص مزاج اور مخصوص ذہنی سانچہ بن گیا ہے اور وہ اس طرح لکیر کے فقیر ہو گئے ہیں کہ پرانی روش سے ذرا بھی ادھر ادھر ہونے میں انھیں گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے اور وہ طرح طرح کے حیلے اور بہانے کر کے خود بھی پستی میں رہنا چاہتے ہیں اور

دوسروں کو بھی رکھنا چاہتے ہیں۔

اگر عربی اور دینی مدارس کے نصاب میں یہ ضروری تبدیلی کسی وجہ سے فوراً ممکن نہ ہو اور جدید وقدیم دونوں قسم کے حامل مدرسے قائم کرنے کی بہ آسانی گنجایش نہ ہو تو موجودہ عربی مدارس میں بقدر ضرورت انگریزی، حساب، سائنس اور عصری علوم پڑھانے کے لیے فارغ التحصیل طلبہ کو مزید دو سال تک تعلیم دی جائے اور اس عرصہ میں اس کمی کی تلافی کردی جائے۔

عصری علوم کے جو ادارے مسلمانوں کے زیر انتظام ہوں ان میں بعض غیر اہم اختیاری مضامین کو نصاب سے نکال کر دینیات کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جاسکتا ہے جس میں عربی قواعد اور زبان وادب کے ساتھ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی بقدر ضرورت تعلیم دی جائے، جنوبی ہند کے اسکولوں اور کالجوں میں یک گونہ اس پر عمل بھی ہو رہا ہے، اگر اس میں زیادہ دشواری اور پیچیدگی ہو تو کالجوں کی تعلیم سے فراغت پانے والے طلبہ کو دو سال کے اندر اسلامی علوم کے اسباق پڑھائے جانے کا نظم واہتمام کرنا چاہیے۔

ذہین اور غیر معمولی استعداد وصلاحیت رکھنے والے طلبہ پر خاص نظر رکھنی چاہیے خواہ یہ عربی مدرسوں کے ہوں یا انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے، اس طرح کے طلبہ کو دونوں طرح کے علوم اس قدر ضرور پڑھا دیے جائیں جس سے وہ دونوں سے فاضل وتبحر بن سکیں۔

جز وقتی کوچنگ کلاس یا شبینہ مدرسے قائم کر کے بھی جدید وقدیم یا دینی وعصری دونوں طرح کی تعلیم کا بندوبست کیا جاسکتا ہے، اس کے لیے دونوں طرح کی تعلیم پانے والوں کی ضرورتوں کے لحاظ سے الگ الگ کلاسوں کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔

عربی مدارس کے نصاب میں ان جدید علوم کو جو وقت اور حالات کے تقاضے

کی وجہ سے ناگزیر ہو گئے ہیں شامل کرنے کا یہ بھی فائدہ ہوگا کہ سرکاری کالجوں اور جدید تعلیم
گاہوں میں عربی پڑھنے والے طلبہ داخلہ کے اہل قرار پائیں گے اور داخل ہونے کے بعد وہ
جدید مضامین میں کمزور نہیں رہیں گے۔

مگر جو لوگ صدیوں سے تقلید کے عادی ہو گئے ہیں اور جن کی رگ و پے میں جمود و تعطل
داخل ہو گیا ہے وہ ان تجویزوں پر چیں بہ جبیں ہوں گے اور اس خدشہ کا اظہار کریں گے کہ اس
طرح دینی عنصر غائب یا بتدریج کم ہوتا جائے گا اور عصری اور غیر دینی مضامین غالب ہوتے
جائیں گے۔ ان کے خیال میں اس معجون مرکب سے طلبہ کو نہ دینی علوم میں دسترس حاصل ہوگی
اور نہ عصری علوم سے آگاہی ہوگی، اس قسم کے اندیشہ ہائے دور دراز ندوۃ العلماء کی اصلاح
نصاب کی تحریک کے وقت بھی ظاہر کیے گئے تھے لیکن یہ سب خدشے تو اس لیے پیدا ہوتے ہیں
کہ مسلمان اپنے لگے بندھے طریقوں اور اصولوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے، اگر واقعی خیال رکھا جائے
اور احتیاط ملحوظ رہے تو یہ سارے کھٹکے دور ہو جائیں گے۔ لیکن اگر وہ قدیم نصاب پر اڑے
رہے اور اس کو بدلنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے تو نتائج بالآخر نہایت مضرت رساں
ہوں گے اور علماء اور دینی مدارس کے فضلا اس ملک میں اجنبی، نامانوس اور بیگانہ ہو کر
رہ جائیں گے جو نہ اپنے ملک کی کوئی خدمت کر سکیں گے اور نہ ان سے ان کی قوم، ان کی ملت
اور ان کے مذہب کو کوئی فیض پہنچے گا۔

اس زمانہ میں معاد کی طرح معاش کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہو گیا ہے، جس سے چشم پوشی
نہیں کی جا سکتی، پہلے دینی مدارس میں دینی علوم کے ساتھ طلبہ کے لیے طب کی تحصیل بھی لازمی
ہوتی تھی، اور یہ خیال عام تھا کہ

العلم علمان علم الادیان — علم دو ہیں دین کا علم اور اجسام و

وعلم الابدان، — ابدان کا علم،

اس کی وجہ سے طلبہ دینی علوم کی تکمیل کے بعد دست نگر اور محتاج نہیں ہوتے تھے
بلکہ رزق کے معاملہ میں خود کفیل ہوتے تھے موجودہ دور میں مسلمان معاشی حیثیت سے
جس قدر پس ماندہ ہو گئے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے اس لیے دینی درسگاہوں میں صنعت
و حرفت کے شعبے کھولنا اور طب کی تعلیم کو فروغ دینا ضروری ہو گیا ہے تاکہ بقدر ضرورت
دینی تعلیم پانے کے بعد طلبہ یا تو کسی صنعت کو سیکھ لیں یا پھر طب کی تحصیل میں لگ جائیں
اس سے ان کی معاش کا مسئلہ درست ہوگا۔ آج طب جدید میں جو حیرت انگیز ترقی ہو رہی ہے
اس سے مسلمان کب تک آنکھیں بند کیے رہیں گے۔

مجرد تعلیم کافی نہیں ہے، تربیت کا مسئلہ اس سے بڑھ کر اہم ہے، اس لیے نصاب میں
اصلاح و ترمیم کے ساتھ بہتر نظام تربیت بھی قائم کرنا ہوگا اور جدید و قدیم دونوں طرح کے
طلبہ کی تربیت کا اہتمام کرنا ہوگا تاکہ طلبہ اسلام و ایمان پر کاربند ہوں اور ان کا ذہن اور
طور طریق اسلامی ہو، اس دور میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے
کہ علما اور طلبہ اسلام کے اصلی نمائندے بنیں اور اپنے اعمال و اخلاق اور سیرت و کردار
سے اسلام کی صحیح تصویر پیش کریں، دینی درسگاہوں کے طلبہ و اساتذہ کی ادائیں اسلام کی
خوبی و صداقت اور حقیقی مسلمانوں کی پاکیزہ اور قابل ستائش سیرت و زندگی کی شہادت
دیں، اس طریقہ سے اسلام سے متنفر اور مسلمانوں سے بیزار لوگوں کی نفرت و بیزاری دور
ہوتی جائے گی۔ عربی مدارس میں تبلیغ و دعوت اور اشاعت اسلام کا شعبہ کھولنے سے
زیادہ ضروری یہ ہے کہ علماء اپنے عمل و کردار سے اسلام کی تبلیغ و دعوت دیں جو نفوس
انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کا سب سے زیادہ مہم، سب سے زیادہ

کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ ہے آج کل مدارس کے ذمہ داروں اور منتظمین کی ساری توجہ عمارتوں کی جانب مرکوز ہو کر رہ گئی ہے، ہر مدرسہ میں اونچی اور شاندار عمارتیں بنائی جارہی ہیں اور تعمیرات پر کروڑوں روپے صرف کیے جاتے ہیں اور اس میں اکثر مدارس میں مسابقت بھی جاری ہے یتطاولون فی البنیان، لیکن نہ تعلیم و تربیت کا نظام بہتر بنانے پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور نہ مدرسین اور اساتذہ کی تنخواہوں پر دھیان دیا جاتا ہے، اگر مدرسین کسی حد تک فارغ البال اور معاشی حیثیت سے مطمئن نہ ہوں تو وہ کس طرح محنت، یکسوئی، توجہ اور انہماک سے تعلیم دیں گے، اصل مقصود تعلیم ہے جو درودیوار سے زیادہ قیمتی ہے اس لیے اس پر ہر حال میں زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ ایک ہی آبادی اور ایک ہی شہر میں متعدد مدارس قائم کیے جاتے ہیں جن سے مسلمانوں میں اختلاف و انتشار بڑھتا ہے، ایک ایک ضلع میں کئی کئی بڑے مدارس کا وجود ایک پسماندہ ملت پر بڑا بوجھ ہے ان سے بھی ان کے اندر انتشار پیدا ہو رہا ہے اور گروہ بندی بڑھ رہی ہے۔

بعض شبہات کا ازالہ

مسلمانوں کو حیات و کائنات کا کوئی علم حاصل کرنے میں جھجک اور ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اگر مقصد خدمت، انسانیت کی فلاح و بہبود اور اعلا انسانی قدروں کا تحفظ ہے تو ہر علم خیر اور محمود ہے اور اگر مفاد پسندی اور دوسرے انسانوں کا استحصال مقصد ہے تو ہر علم موجب شر و فساد اور مذموم ہے، مولانا روم نے اسی نکتہ کی جانب اس طرح اشارہ کیا ہے

علم را بر تن زنی مارے بود   علم را بر دل زنی یارے بود

نہ کسی علم سے دین و ایمان کو کوئی خطرہ ہے اور نہ وہ قرآن مجید اور احادیث نبوی کے متصادم ہے قرآن مجید نے کائنات کا دقت نظر سے مطالعہ کرنے، اس کے نظام اور

اس کی مخلوقات پر غور کرنے اور تفکر و تدبر سے کام لینے کی بار بار دعوت دی ہے، اشیا کے حقائق کو معلوم کرنے اور آفاق و انفس کا مشاہدہ کرنے کی پیہم تلقین کی ہے اور ارض وسما اور بحر و بر کو انسان کے لیے مسخر کیے جانے کے نتیجہ میں حیات و کائنات کے امور و مسائل کی تحقیق و جستجو کا اس سے مطالبہ کیا ہے

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یونس ۱۰۱)

ان سے کہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اسے آنکھیں کھول کر دیکھیں۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (ذاریات: ۲۱)

اور خود تمھارے اپنے اندر بھی گوناگوں شہادتیں اور نشانیاں ہیں کیا تمہیں سجھائی نہیں دیتا۔

انسان کے لیے کائنات کو مسخر کر کے اس کو جو ذمہ داری سپرد کی گئی ہے اسے وہ سائنسی علوم حاصل کر کے پوری کر سکتا ہے اسی طرح فنی اور تکنیکی ترقیوں کو عالم انسانیت کے لیے مفید اور نفع بخش بنایا جا سکتا ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی ہو یا دنیا کا کوئی اور علم و تجربہ اس سے اسلام کے تصادم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اصل مسئلہ صرف اس قدر ہے کہ ان علوم کو کس طرح اسلام کے ہم آہنگ کیا جائے، اس سلسلہ میں ہماری گذشتہ تاریخ سے بڑی رہنمائی ملتی ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے وہ تمام علوم حاصل کیے جو پہلے سے موجود تھے مگر انھوں نے کسی علم و فن، کسی تہذیب و تمدن اور مذہب کو اپنے اوپر اس طرح مسلط نہیں کیا کہ وہ اسی میں ضم ہو کر رہ جائیں اور کتاب و سنت ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں،

اپنی خصوصیات کو باقی رکھتے ہوئے انھوں نے تحصیل علم کو اولیت اور ترجیح دی خواہ وہ کسی مذہب و قوم یا ملک کا ہو کیونکہ :-

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن — حکمت کی بات مسلمان کی گمشدہ متاع

فحیث وجدھا فھو احق بھا[1] — ہے پس وہ اسے جہاں بھی پائے اسکا زیادہ مستحق ہے۔

اسی لیے مسلمانوں نے دوسرے مذاہب کے علماء و حکماء سے استفادہ کیا، دوسری قوموں کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، تیسری صدی ہجری کے بعد کئی صدیوں تک مسلمانوں کی تعلیم گاہیں علمی مراکز، تجربہ گاہیں اور سائنس تحقیق و اکتشاف کا گہوارہ بنی رہیں جہاں سے بے شمار مفکرین، ماہرین علوم اور سائنس داں پیدا ہوئے جنھوں نے ریاضی، جیومیٹری، الجبرا، طب، نجوم، فلکیات اور ارضیات وغیرہ مختلف فنون و مضامین میں تحقیقات و معلومات کا انبار لگا دیا جس کی خوشہ چینی آج تک جاری ہے، موجودہ سائنس، طب اور ریاضی ہمارے انہی سائنسدانوں اطبا اور ریاضی کے ماہرین کی رہین منت ہے اور ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ علم، بصیرت، تحقیق، واکتشاف کی جو روشنی دنیا میں پھیلی ہوئی ہے وہ ہمارے ہی اسلاف کرام کا فیضان ہے جن کا کوئی ہمسر اور حریف ان کے دور کی قوموں میں نہ تھا۔

یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ جب تک ان علوم پر مسلمانوں کی دسترس اور بالادستی رہی اور وہ انکے چشموں سے مکمل طور پر سیراب ہوتے رہے، اسوقت تک سائنس اور دوسرے طبیعی علوم کا منبع خدا پرستانہ، خلق خدا کی خدمت اور انسان کی فلاح و بہبود رہا، مگر جب یورپ کی قوموں نے ان پر اپنا تسلط جمایا تو انھوں نے ان کو الحاد، بے دینی اور مادیت کے فروغ

[1] جامع ترمذی ابواب العلم و سنن ابن ماجہ باب الحکمۃ۔

اور خلق خدا کے استحصال کا ذریعہ بنالیا، اس صورت حال کا اقتضا بھی یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر علما و محققین، قانون کے ماہرین، علوم طبیعی کے فضلا، سائنس و ریاضی داں، انجینیر اور ڈاکٹر پیدا ہوں تاکہ ان فنون پر سے یورپ کی اجارہ داری ختم ہو اور یہ الحاد و مادیت اور خدا بیزاری کا سبب بننے کے بجائے خدا پرستی، اعلائے کلمۃ اللہ، ملت بیضا کی خدمت اور انسانی فلاح و ترقی کا ذریعہ ہوں،

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جدید علوم کو شجر ممنوعہ سمجھکر ان سے بیزار رہنا نہ مسلمانوں کے لیے مناسب ہے اور نہ یہ انکے مفاد میں ہے، اگر وہ اپنی پرانی روش پر قائم رہ کر ان سے کنارہ کش رہتے ہیں تو اقبال کی طرح ہم کو بھی ان سے شکوہ سنج ہونا پڑے گا کہ

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے — سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

مسلمان خیر امت ہیں، اس لحاظ سے ان پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ملک میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کا سدباب کرنا، بگڑے ہوئے ماحول کی اصلاح کرنا، حق کو فروغ دینا اور باطل کا قلع قمع کرنا ان کا اہم فرض ہے جو اس ملک کی سچی اور حقیقی خدمت ہے، ملک و ملت دونوں کے لیے اپنے کو مفید اور بہتر بنانے کے لیے انہیں دینی و عصری علوم میں دستگاہ پیدا کرنا ناگزیر ہے، اس کے بغیر نہ وہ دین کے تقاضے پورا کرسکتے ہیں اور نہ ملک کی خدمت اور بھلائی کا کام کرسکتے ہیں جس کی اس وقت شدید ضرورت ہے۔

اسوقت درحقیقت علما کو خانقاہوں اور مدرسوں کے زاویوں سے نکل کر ملک و ملت کی قیادت و رہنمائی کی زمام کار سنبھالنی ہے جو سلف صالحین کا طغرائے امتیاز رہا ہے، تاکہ یہ ملک جنت نشاں بن جائے۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری — کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

اُردو میں نعت گوئی

از

جنابِ مختار ٹونکی صاحب ٹونک راجستھان،

نعت کا لفظ سرورِ کائنات، فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثنا کے لیے مخصوص ہوگیا ہے گو نعت کوئی شاعرانہ صنفِ سخن نہیں ہے مگر اب نعتیہ شاعری نے ایک مستقل صنفِ سخن کی صورت اختیار کرلی ہے اور نعت گو شعراء نے اپنے طائرِ خیال سے اسے معراجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ جس مقدس ذاتِ ستودہ صفات کی ثنا وستائش خود خالقِ کائنات نے یہ کہہ کر کی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ — بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر

عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا — درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی

عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ — ان پر درود بھیجو اور سلام بھیجو،

اور جس صنف کو سرکارِ دو عالمؐ نے نہ صرف پسند فرمایا ہو بلکہ اس میں شعر گوئی کی دعوت بھی دی ہو، شعراء کا کلام سنکر انھیں عزت بخشی ہو اور ترمیم واصلاحِ سخن سے نوازا ہو۔ کفار کی مبارزت طلبی کے موقع پر شعر کا جواب شعر سے دینے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی ہو۔ اس میں کیوں نہ محبانِ رسولؐ اور عاشقانِ نبیؐ اپنے لختہائے جگر اور پارہ ہائے دل کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر پیش کریں اور عقیدت واحترام کی خوبصورت کلیاں چن کر پاکیزہ جذبات واحساسات

کے خوش رنگ پھولوں کا گلدستہ بارگاہِ رسالت میں نچھاور کریں دراصل مدحِ رسولؐ جذبۂ ایماں کی نشانی اور ذکرِ نبیؐ خداوند قدوس کی ہم زبانی ہے۔ علاوہ ازیں حمدِ خدا اور نعتِ رسولؐ سے نطق کو درجۂ قبول نصیب ہوتا ہے ؎

تکلم بود مایہ دارِ قبول — ز حمدِ خداوند نعتِ رسولؐ

دوسرے لفظوں میں حمد ونعت شاعری کا اعلیٰ علیین ہے۔ جس طرح خدائے پاک وبرتر رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہے اسی طرح سرکارِ دو عالمؐ رحمت اللعالمین اور خیر البشر کے القاب سے مختص ہیں۔ بارگاہِ رسالت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے والے شعراء ہر قوم، ہر فرقے اور ہر ملک میں سخن سنج رہے ہیں اور ہر عہد، ہر زبان اور شاعری کی ہر ہیئت میں نعت گوئی نے اپنے رنگا رنگ جلوے دکھائے ہیں۔ سخنورانِ عالم نے بلا تفریق مذہب وملت مدح وثنائے رسولؐ میں رطب اللسان ہوکر اپنی زبان وقلم کی تطہیر کی ہے اور اپنے جذبۂ صادقہ کو جلا بخشی ہے امام الانبیاء، ختم الرسل کی ذاتِ گرامی جامع الصفات ہے اور کرۂ گیتی کی دوسری بڑی شخصیتیں اور نسلِ انسانی کے دیگر ممدوحین آپؐ کے سامنے بے حیثیت وکمتر ہیں جیسا کہ حسان ابن ثابت نے اپنے مرثیہ میں کہا ہے ؎

وما فقد الماضون مثل محمدؐ — ولا مثل حتی القیامۃ یفقد

نہ تو ماضی میں محمدؐ جیسے کو دنیا نے گم کیا ہے — اور نہ قیامت تک گم کرے گی

ابتدائے اسلام سے ہی نعت ایشیائی شاعری کا پسندیدہ موضوع رہی ہے اور چونکہ اس کے لیے کوئی صنف مخصوص نہیں اس لیے ہر صنفِ سخن میں نعتیہ اشعار موجود ہیں زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی شاعری منتہائے کمال پر پہنچ گئی تھی۔ ظہورِ اسلام نے عربی شعر وادب کے زور وشور سے بہتے ہوئے دھارے کا رُخ موڑ دیا اور قرآن شریف کی فصاحت

وبلاغت نے بلند بانگ دعوے کرنے والے شعراء کی گردنیں خم کر دیں۔ موضوعاتِ شعر پر قیود و بندش عائد کی گئی، شاعرانہ تعلی دبے راہ روی روک دی گئی اور شاعری کو اعلائے کلمۃ الحق اور تبلیغ دین و اشاعت اسلام کا ذریعہ بنایا گیا۔ غیر مسلم شعراء کی ہجو اور نازیبا اشعار کے جواب میں سرور کائناتؐ نے ہجو لکھنے کا حکم دیا۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے شعراء نے اپنے عظیم الشان قصیدوں میں حضورؐ پر نور کی مدح گستری اور کفار کی ہرزہ سرائی شروع کر دی، یہی نعتیہ شاعری کا آغاز ہے

عربی کا سب سے پہلا نعتیہ قصیدہ میمون بن قیس سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن ابو ولید انصاریؓ اور حسان بن ثابتؓ کو اپنے زمانے کے تمام شعراء میں سبقت و فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ انھوں نے نعت گوئی کا واقعی حق ادا کیا۔ حضرت حسانؓ پہلے اور آخری نعت گو شاعر ہیں جن کے لیے سرور کائناتؐ نے بار بار دعائیں کیں[1]۔ وہ بارگاہِ رسالت اور دربار نبوت کے خاص شاعر تھے۔ انھوں نے ایک سو بیس سال تک شاعری کی۔ ساٹھ سال دور جاہلیت اور ساٹھ سال عہد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں، دونوں زمانے میں شاعری سے ناموری و شہرت حاصل کی۔ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت کے مطابق حضور اکرمؐ حسان ابن ثابتؓ کے لیے مسجد میں ایک منبر رکھوا دیتے تھے جس پر چڑھ کر وہ فخریہ اپنے اشعار سنایا کرتے تھے[2]۔ ان کے نعتیہ قصیدوں میں مبالغہ اور غلو نہیں ہے۔ انھوں نے انھیں باتوں کو منظوم کیا ہے جن کی اسلام نے اجازت دی ہے اور یہ قصیدے فصاحت و بلاغت کے ساتھ نہایت جامع ہیں اسی لیے فارسی اور اردو کے اچھے نعت گو شعراء کو حسان کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ نبی کریمؐ کے مداح شعراء کی تعداد ۱۸۰ تھی جس میں بارہ خواتین بھی شامل تھیں[3]

---

[1] مشکوٰۃ شریف ص ۴۰۹ [2] ایضاً ص ۴۱۰ [3] شمع انجمن ص ۱۸۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت حمزہؓ، سیدہ فاطمہ زہراؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت ضرارؓ، حضرت کعب ابن مالکؓ اور حضرت عبد اللہ ابن رواحہؓ کے اسمائے گرامی بھی اس فہرست میں شامل ہیں، کعب بن زہیرؓ کا درج ذیل شعر نعتیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔

ان الرسول لسیف یستضاء بہ   بے شک رسول ایک ایسی تلوار ہیں جس سے

مھند من سیوف اللہ مسلول   روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ ہندی لوہے کی

برہنہ خداوندی شمشیر ہیں۔

یہ واضح رہے کہ کعب بن زہیرؓ نے فتح مکہ سے پہلے امام الانبیاءؐ کی ہجو اور مذہب اسلام کی مخالفت میں بہت سے قصائد کہے تھے چنانچہ باغیوں کی فہرست میں ان کا نام بھی تھا باوجودیکہ ان کے بھائی جبیرؓ پہلے ہی دین فطرت اختیار کر چکے تھے۔ دونوں بھائیوں میں مراسلت ہوئی۔ بالآخر کعبؓ نے طے کیا کہ "میں خود دربار رسالت میں حاضر ہوں گا اگر رسول اکرمؐ کو صحیح معنوں میں حلیم اور صاحب مروت پاؤں گا تو ایمان لے آؤں گا ورنہ موت کو ترجیح دوں گا۔ دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک پکڑ کر اس طرح کہا "اگر کعب اپنی حرکات پر اظہار ندامت کر کے معافی چاہے تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟" رسول اکرمؐ نے فوراً ارشاد فرمایا "سب معاف" یہ سنتے ہی کعبؓ نے کہا "میں ہی کعب ہوں" اور اپنا مشہور قصیدہ بانت سعاد فی البدیہہ سنانا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت اطمینان اور دلچسپی کے ساتھ اسے سنتے رہے اور جب کعبؓ نے مندرجہ بالا شعر پڑھا تو آپؐ نے خوش ہو کر اپنی مقدس چادر ان کے کندھوں پر ڈال دی۔ علاوہ ازیں آپؐ نے اس شعر میں اصلاح بھی فرمائی۔ حضرت کعبؓ نے رسول اللہؐ کو "سیوف ہند" سے تشبیہ دی تھی جس پر رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا سیوف کی بجائے "نور" اور "سیوف اللہ" کی بجائے

نیسوف اللہ" کہو۔ شعر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلاح شدہ الفاظ ہی موجود ہیں۔

عربی سے نعت گوئی فارسی میں منتقل ہوئی۔ فارسی شعر و ادب کی تاریخ میں ناصر خسرو اور حکیم سنائی نعت گو شعراء کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔ سرورِ کائناتؐ اور دوسرے مذہبی پیشواؤں سے وابستگی ناصر خسرو کا مقصد حیات ہے ایک جگہ کہا ہے:

مرا گر ملکِ ماموں نیست شاید
که افزونم زِماموں است ماروں

بہ آلِ مصطفیٰ در عالم نطق
فریدونم، فریدونم، فریدوں

مگر جوشِ محبت میں کبھی آداب نعت گوئی سے تجاوز نہیں کیا۔ ناصرؔ نے جن اخلاقی قصیدوں کی داغ بیل ڈالی تھی سعدی شیرازیؒ نے اسے بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ ان کا یہ نعتیہ کلام بے نظیر ہے:

بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ و آلہٖ

ایجاز و اختصار اور جامعیت و معنویت شیخ سعدیؒ کی خصوصیات ہیں ذیل کے شعر میں کہتے ہیں کہ ایک ایسے یتیم بچے نے جو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا؛ ہفت اقلیم کے سارے کتبخانوں پر پانی پھیر دیا اور خطِ نسخ کھینچ دیا ہے

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ ہفت ملت بشست

مولانا جامیؒ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ نعت گویانِ عالم میں ان کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ کلام فصیح و بلیغ ہونے کے ساتھ بہت دل پذیر اور موثر ہے "نقیم تسم یا حبیبی کم تنامی" سے لے کر "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" تک ان کے نعتیہ اشعار عقیدت و ارادت سے معمور ہیں۔ فرماتے ہیں:

اے عربی نسبت واقی لقب
بندہ تو ہم عجم و ہم عرب

تیغ عرب زن کہ فصاحت تراست
صید عجم کن کہ ملاحت تراست

اور پھر حضور اکرمؐ سے دست بستہ عرض کرتے ہیں:

یا صاحب الجمال و یا سید البشر
من وجہک المنیر لقد نور القمر

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

قدسیؔ کے کلام کی صدائے بازگشت تصوف کے حلقوں میں آج بھی گونج رہی ہے۔ ان کی نعتیں محفلوں میں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور اب تک دل نوازی کی کیفیت پیدا کرتی ہیں:

مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمالیست بدیں بو العجبی

چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی، ہاشمی و مطلبی

ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات
رحم فرما کہ زحد می گذرد تشنہ لبی

عاصیانیم زِ ما نیکئی اعمال مپرس
سوئے ما روئے شفاعت بکن از بے سببی

سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوئے تو قدسیؔ پئے درماں طلبی

دوسرے فارسی شعراء میں حافظؔ، رومیؔ، عطارؔ، عراقیؔ، نظامیؔ، شہیدیؔ، بیدلؔ وغیرہ نے خصوصیت کے ساتھ چمنستان نعت میں شاداب و شگفتہ پھول کھلائے ہیں، ہندوستان میں امیر خسروؔ، مرزا غالبؔ، عزیز لکھنوی، شیخ غلام قادر گرامی اور علامہ اقبالؔ نے فارسی زبان میں ارمغانِ نعت پیش کیا ہے۔

فارسی کے تتبع و تقلید میں نعت گوئی اردو زبان میں بھی جلوہ گر ہوئی۔ اگرچہ ابتداً اردو میں نعتیہ اشعار کا باقاعدہ طور پر کسی شاعر نے اہتمام نہیں کیا کیونکہ نعت گوئی سے

عہدہ برآ ہونا بہت مشکل کام ہے۔ حدِ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سرورِ کائناتؐ کی ذات ستودہ صفات کی مدحت و تحسین بازیچۂ اطفال نہیں اسی لیے تو حکیم مومن خاں مومنؔ کو کہنا پڑا تھا،

صد بار بیش بصید مضمون نعت پیغمبر امی لقب دام گسترده ام و ہزار نوبت تگاپو بطریق توصیف محمد عربی صلوٰۃ اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ کہ تشریف وما ینطق عن الھویٰ بر بالایش راست آمده برده۔ آخر خویشتن را اسیرِ دام واماندگی یافتم و براہِ عجز و انکسار شناختہ آمدے [1]

سو بار پیغمبر امی لقب کی نعت کے مضمون کو شکار کرنے کے لیے میں نے دام بچھایا اور ہزار دفعہ حضورؐ کی تعریف کی راہ میں (جنکے قدِ مبارک پر خلعت وما ینطق عن الھویٰ موزوں ہے) صعوبت اٹھائی۔ بالآخر اپنے آپ کو واماندگی کے دام میں اسیر پایا اور عجز و انکسار کی راہ اختیار کرنا پڑی۔

نعت کہنے کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ شاعر عشقِ نبیؐ اور محبتِ رسولؐ کے مطہر جذبے سے سرشار ہو اور اپنی وارداتِ قلبی اور کیفیاتِ دلی کی آئینہ داری اس طرح کرے کہ دامنِ احتیاط ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ کمالاتِ نبوت اور مدارجِ رسالت کی تصویرکشی کرتے وقت ذرا سی بے احتیاطی 'نعت' کو 'حمد' کی حدوں میں داخل کر دیتی ہے اور 'عبد' و 'معبود' کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ مزید برآں کہ کہیں یک سرِ مو انحراف سے رسول اللہؐ کے اوصاف و محاسن انسانی سطح پر آجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ایک دردمند اور ہوشمند شاعر ہی اس 'وادیٔ پرخار' میں قدم رکھنے کی جسارت و جرأت کر سکتا ہے عربی و فارسی کے اکثر نعت گو شعرا نے آپؐ کی بارگاہِ اقدس میں اپنی عقیدت و احترام اور محبت و رافت کے پھول پیش کرنے میں آداب و لوازم کو ملحوظ رکھا ہے ع

با خدا دیوانہ و با مصطفیٰ ہشیار باش

اس کے باوجود اردو زبان کا ابتدائی شعری ذخیرہ نعت کے درہائے بیش بہا سے

[1] انشائے مومن، مقدمہ حکیم احسن اللہ خاں

خالی نہیں ہے۔ قدیم شعرا کے دواوین اور مثنویوں کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا تھا اردو کی کثر اصناف میں نعتیہ کلام کہا گیا ہے یہاں تک کہ عاشقانہ غزلوں کے مقطعوں میں بھی عموماً نعتیہ مضامین باندھے گئے ہیں ع

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کو نبی کریمؐ اور حضرت علیؓ سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ اپنی غزلیں بھی ان کے نام معنون کر دیتا تھا اور ظفر شاہ کے قلعۂ معلیٰ میں باقاعدہ نعتیہ محفلیں منعقد ہوتی رہی ہیں۔ نصرتی نے محمد عادل شاہ کے عہد میں ایک 'معراج نامہ' لکھا تھا جس میں ۱۱۳۱ اشعار تھے۔ قلی قطب شاہ کہتے ہیں:

تج مکھ اجت کے جوت تھے عالم دپن ہارا ہوا تج دین تھے اسلام نے مومن جگت سارا ہوا

یک لک انسٹی پیغمبراں اُپجے جگت میانے ولے تج پر نبوت ہے ختم سب تھے توں ہی پیارا ہوا

صدقے نبیؐ جم راج کر قطب زماں آنند سوں
قدرت تھے کہکشں کر ندیاں کے سو آرا ہوا

ولیؔ دکنی کے قصیدے بھی مذہبی عقیدتوں کے آئینہ دار ہیں۔ ان کا طویل ترین قصیدہ جس کا آغاز اس مطلع سے ہوتا ہے:

عشق میں لازم ہے اول ذات کو فانی کرے ہو فنا فی اللہ دایم یادِ یزدانی کرے

سرورِ کائناتؐ کی مدح میں کہا گیا ہے اور دکن کے آخری بڑے شاعر سراجؔ اورنگ آبادی اپنے قصیدے کے آخری شعر میں اس طرح کہتے ہیں ؎

لگا ہے ہاتھ اسے دامنِ رسولِ کریمؐ سدا ہے صرصرِ غم میں سراجؔ بے پروا

شمالی ہند میں سوداؔ، میرؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، نظیرؔ، نسیمؔ، میر حسنؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، شہیدیؔ،

حالیؔ، ظفرؔ، مجروحؔ، صہبائیؔ، امیرؔ مینائی اور محسنؔ کاکوروی نے نعتیہ اشعار کے جواہر پاروں سے اپنے کلام کو مالا مال کیا ہے۔ سوداؔ نے سب سے پہلے نعتیہ قصیدوں کو فروغ دینے میں بڑی کاوشیں کیں اور اپنے فضل و کمال کا خوب جوہر دکھایا۔ مثال کے طور پر ایک قصیدے میں پیغمبر اسلامؐ کی توصیف اس طرح بیان کی ہے:

جو صورت اسکی ہے لاریب وہ ہے صورت ایزد — جو معنی اس میں ہیں بے شک وہ ہیں معنیٔ ربانی
حدیث من رآنی دال ہے اس گفتگو اوپر — کہ دیکھا جس نے اسکو ان نے دیکھی شکل یزدانی

قرآن وحدیث کے حوالے اور مذہبی اصطلاحیں بھی ان کے اشعار کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں خدائے سخن میر محمد تقی میرؔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو درود وسلام بھیجتے ہوئے کچھ الگ انداز سے مدح گستری کرتے ہیں:۔

السلام اے رازدار داورِ جاں آفریں — السلام اے لامکاں کے حاکم مسند نشیں
ذات تیری جوں خدا کی ذات ہے والاصفات — بے شریک و بے عدیل و بے نظیر و بے قریں
یہ شرافت، یہ سیادت، یہ تقدس، یہ کمال — یہ تنزہ، یہ تعلی، یہ تفوق ہے کہیں
مقصدِ دل آشنایاں، مدعائے عاشقاں — آرزوئے اہلِ عرفاں، مطلبِ اہلِ یقیں

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ کی زبان و بیان میں بڑی پختگی اور فطری آمد ہے ایک قصیدے کے گریز میں ان کی نزاکتِ تخیئل دیکھنے کے قابل ہے:

مجھ کو تو عروض آتی ہے نے قافیہ چنداں — اک شعر سے گرویدہ مرے پیر و جواں ہیں
سو کیوں نہ ہوں، ہوں بھی تو میں ایسے کا ثناخواں — جسکے لیے مخلوق یہ سب کون و مکاں ہیں
ماہِ عرب، امی لقب، اعنی کہ محمدؐ — نت جس کی طرف دیدۂ اختر نگراں ہیں

انشاءؔ نے نعت ومنقبت میں زیادہ زور طبع صرف کیا اور مشکل ترین زمینوں میں پُرزور

قصائد لکھے نظیرؔ اکبرآبادی نے مذہبی شاعری کے بکثرت عنوانات قائم کرکے اظہار خیال کیا اور مومنؔ وغالبؔ نے بھی اپنی جولانیٔ فکر سے کرشمہ کاری کی ہے۔ انتخاب کلام اور مثالیں طوالت سے خالی نہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ دورِ قدماء سے مومنؔ وغالبؔ تک نعت کے لیے صرف قصائد مخصوص تھے لیکن مولوی غلام امام شہیدؔ نے جدت و وسعت پیدا کی اور نعت کو قصیدے کے علاوہ غزل، مثنوی، ترجیع بند وغیرہ سے روشناس کرایا اگرچہ شعرائے دکن نے بھی جستہ جستہ غزلوں اور مثنویوں میں نعتیہ اشعار لکھے ہیں لیکن ان میں شعریت کم اور واقعہ نگاری زیادہ تھی مگر مولوی غلام امام شہیدؔ نے ان میں شاعرانہ رنگ کی آمیزش کرکے تشبیہات واستعارات سے دلچسپ بنایا۔ ایک بحر طویل مسجع قصیدے میں سے چند اشعار پیش ہیں جن سے ان کے شاعرانہ طرز بیان کا اندازہ بخوبی ہوسکے گا:

باغِ جہاں آباد ہے، یاں سرو بھی آزاد ہے — قمری نہایت شاد ہے، نہ صید نہ صیاد ہے
ہاں محفلِ میلاد ہے، وقتِ مبارکباد ہے — جبریلؑ کو ارشاد ہے، مشہور کردے یہ سخن
نور خدا پیدا ہوا، خیر الوریٰ پیدا ہوا — بحرِ عطا پیدا ہوا، ابر سخا پیدا ہوا
نجم الہدیٰ پیدا ہوا، بدرالدجیٰ پیدا ہوا — شمس الضحیٰ پیدا ہوا، پیدا ہوا شاہِ زمن

اسی زمانے میں لطف علی خاں لطفؔ نے بھی نعت گوئی کو اپنا خاص موضوع بنایا چنانچہ تذکرۂ 'مہر جہانتاب'، میں مذکور ہے۔ "و دیوانش تماما در نعت"۔ لطفؔ کا کلام بھی لطف سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں:

خدا کے دوست پہ اے دوستو درود پڑھو — جہنمی ہو، بہشتی بنو درود پڑھو
تم ان کے موئے مبارک کا رتبہ کیا جانو — جو اس کے وصف سنو، مومنو درود پڑھو
خدا کا صاف یہ قرآں میں حکم ناطق ہے — مرے نبیؐ پہ تم اے مومنو درود پڑھو

کرامت علی شہیدی بھی اس دور کے ایک اچھے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے ایک نعتیہ قصیدے میں یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ

مدینہ کی زمیں کے گر نہ لائق ہو مرا لاشہ ۔۔۔ کسی صحرا میں واں کے طعمہ ہوں میں دام اور دد کا

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے ۔۔۔ قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

خوش قسمتی سے شہیدی کی یہ آرزو پوری ہوئی مولانا عبد السلام ندوی لکھتے ہیں:

"۱۲۵۵ھ میں فریضۂ حج ادا کرکے وہ مدینہ منورہ کو جا رہے تھے، راستہ میں بیمار پڑے اور ۲ صفر ۱۲۵۶ھ میں جب تمام منزلیں طے کرتے ہوئے ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے روضۂ مطہرہ نظر آتا تھا تو اس پر ایک حسرتناک نظر ڈالی اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا"[1]

متاخرین کے دور میں دو معتبر شعرا کے نام نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں جنھوں نے نعت گوئی کے تنگ میدان کو وسیع و وقیع بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہ نامور نعت گو شعرا منشی امیر مینائی اور محسن کاکوروی ہیں۔ امیر مینائی نے قصائد، غزلیات، رباعیات، ترجیع بند، مخمس، سلام، مناجات وغیرہ پر مشتمل نعتیہ مجموعہ "محامد خاتم النبیین" لکھ کر رسول مقبول سے اپنی سچی عقیدت کا اظہار کیا یہی نہیں انھوں نے متعدد مثنویاں اور نظمیں بھی اسی موضوع پر لکھیں اور "معجزات سرور کائنات" منظوم کیے۔ کلام میں اگرچہ اہل زبان کی فصاحت اور تشبیہات و استعارات کی جدت ہے مگر معنی سے زیادہ الفاظ پر زور دیا گیا ہے۔ "معجزات" میں کچھ وضعی اور ضعیف روایات بھی شامل کر لی گئی ہیں نمونۂ کلام سے ان باتوں کی توضیح ہو سکتی ہے:

[1] شعر الہند حصہ دوم ص ۲۱۱۔ مولانا عبد السلام ندوی، گل رعنا میں بھی یہی مذکور ہے۔ ص، ۳۲۷۔

خلق کے سرور، شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔ مرسل داور، خاص پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم

نور مجسم، نیر اعظم، سرور عالم، مونس آدمؑ ۔۔۔ نوحؑ کے ہمدم، خضرؑ کے رہبر صلی اللہ علیہ وسلم

دولت دنیا خاک برابر ہاتھ کے خالی دل کے تونگر ۔۔۔ مالک کشور، تخت نہ افسر صلی اللہ علیہ وسلم

ہر سے ملو ریشہ ریشہ نعت امیر اپنا ہے پیشہ ۔۔۔ ورد ہمیشہ دن بھر شب بھر صلی اللہ علیہ وسلم

نامِ عاصی داخلِ فردِ شفاعت ہو گیا ۔۔۔ خاتمہ بالخیر احمدؐ کی بدولت ہو گیا

جھونکا جو کوئی آئے مدینے کی ہوا کا ۔۔۔ ٹھنڈا ہو کلیجہ ترے مشتاقِ لقا کا

بیمار ہوں میں الفتِ محبوبِ خدا کا ۔۔۔ اس درد میں ملتا ہے مزا مجھ کو دوا کا

محسن کاکوروی نے نعت گوئی کو باقاعدہ فن کے طور پر اپنایا۔ انھوں نے اپنی تمام ادبی و شعری صلاحیتیں نعت کے لیے وقف کر دی تھیں۔ خود ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ہے تمنا کہ رہے نعت سے میری خالی ۔۔۔ نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ، نہ غزل

اور یہ بھی اعلان کیا کہ ؎

ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسن ۔۔۔ کلام نعتیہ رکھا مری زباں کے لیے

محسن کاکوروی کے لیے مشہور ہے کہ وہ جس وقت داہنے ہاتھ سے نعت لکھتے تھے تو دنیا کی کوئی اور چیز لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بہرحال انھوں نے اپنے شاعرانہ کمال اور ندرتِ خیال سے نعت گوئی کو ایک پُروقار اور شاندار صنف سخن بنانے کی مستحسن خدمات انجام دیں اور اردو کے سب سے بڑے نعت گو شاعر تسلیم کیے گئے۔ انکی شاعرانہ قوتیں ہر صنف سخن میں کھل کر سامنے آئی ہیں۔ "چراغ کعبہ" اور "صبح تجلی" مثنویاں ان کے شاعرانہ کمال کا بہترین نمونہ ہیں اور قصیدہ "مدیح خیر المرسلین" ایک معرکۃ الآرا کارنامہ ہے

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

کی تشبیب میں بڑی سحرانگیزی اور جادو اثری ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی کے بقول "سرور کائنات ؐ کی نعت ایک دوسرے مذہبی پیشوا کی زندگی کے پس منظر میں پیش کرنا محسن ہی کا کام تھا اور کمال یہ ہے کہ دونوں کی انفرادیت اور امتیازی خصوصیت برقرار رہتی ہے"[1]

محسن کا کلام صنائع بدائع اور تلمیحات و استعارات سے پُر ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر وہ موضوع کو اتنا پیچیدہ اور گنجلک بنا دیتے ہیں کہ کم استعداد حضرات پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے مگر ان کی قدرت بیان کی داد دینا پڑتی ہے۔ سراپائے رسول ؐ کی لفظی تصویر انھوں نے کچھ اس طرح کھینچی ہے:

کیوں نہ سو جان سے ہو گلزار بہار معنی ۔۔۔ محو رنگینیٔ تصویر سراپائے نبی ؐ
یہ وہ صورت ہے کہ دیکھی نہ سنی ایسی کبھی ۔۔۔ تھی یہی شکل مقدس کہ ازل میں جو کھنچی

ناز سے خامۂ قدرت نے کہا واہ رے میں
بول اٹھا عارض پُرنور کہ اللہ رے میں

کیسی تصویر کہ ہے صبح بہار امکاں ۔۔۔ کیسی تصویر کہ ہے آئینہ پرداز جہاں
کیسی تصویر کہ ہے لوح و قلم نور افشاں ۔۔۔ کیسی تصویر کہ ہے کلک مصور نازاں

کیسی تصویر کہ سب صلی علیٰ کہتے ہیں
کیسی تصویر کہ سب جل علیٰ کہتے ہیں

کیسی تصویر جسے کھینچ کے نقاش ازل ۔۔۔ خود لگا کہنے کہ ہر وصف میں ہے تو افضل
تیری صورت سے کھلے ما قل و دل ۔۔۔ انبیا شرح مفصل ہیں تو تو متن مجمل

تو ہے خورشید ترے سامنے انجم ہیں نبی ؐ
تو ہے شمسیہ تصور میں تو سب ہیں قطبی

[1] اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۱۴۷۔ ڈاکٹر محمود الٰہی۔

نعت کی تراش خراش کر کے اسے "دُرِ یتیم" بنانا خواجہ الطاف حسین حالی کا کام ہے۔ حقائق کی سچی تصویر اور غضب کی تاثیر حالی کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و شمائل، اخلاق و عادات اور ہدایات و ارشادات کو نہایت صفائی اور سادگی سے شعری جامہ پہنایا ہے اگرچہ ایک قصیدے میں وہ کہتے ہیں:

بنے ہیں مدحتِ سلطان دوجہاں کے لیے ۔۔۔ سخن زباں کے لیے اور زباں وہاں کے لیے
حریف نعتِ پیمبر نہیں سخن حالی ۔۔۔ کہاں سے لائیے اعجاز اس بیاں کے لیے

مگر ان کے مشہور زمانہ "مسدس" سے زیادہ مستند، معتبر اور موثر نعتیہ نظم دیکھنے کو نہیں ملتی بقول صالحہ عابد حسین: "پیغمبر اسلام محمد مصطفٰی ؐ کی نعت میں شاعروں نے گذشتہ چودہ صدیوں میں کیا کچھ نہیں کہا لیکن مسدس جو چند نعتیہ بند ہیں وہ ایک طرف عقیدت اور ارادت کی اور دوسری طرف حقیقت اور صداقت کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتے ہیں"[1]

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا ۔۔۔ مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا ۔۔۔ وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا ۔۔۔ بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا ۔۔۔ قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

[1] یادگار حالی ص ۱۷۶۔ صالحہ عابد حسین۔

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اسکی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی

نئی اک لگن دل میں سب کے لگادی
اک آواز میں سوتی بستی جگادی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اٹھے دشت وجبل نام حق سے

مولانا حالی نے نعت گوئی کو جو نیا رنگ وآہنگ دیا اور شعرائے دورِ جدید کے لیے جو بہترین نمونہ قائم کر دیا اس کی بدولت حالی کے بعد کے شعراء کے کلام میں مذہبی عظمت اور دینی متانت کے اجزاء شامل ہو گئے اور نعت نئی فکری توانائی اور شعری دلنوازی کے ساتھ معراجِ کمال کی منزلیں طے کرنے لگی چنانچہ آگے چل کر اکبر الہ آبادی، آسی غازیپوری، جلیل مانکپوری، علامہ اقبال، اقبال سہیل، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، ظفر علی خاں وغیرہ نے نعت کو فرش سے عرش پر پہونچا دیا ہے اور اس کے بعد بے خود بدایونی، جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، بہزاد لکھنوی اور حمید صدیقی نے اپنی جولانگاہ بنا کر اسے مقبول خاص و عام بنایا ہے۔ تفصیل اور مثالوں کے لیے ایک دفتر چاہیے، اس لیے برگزیدہ شعراء کی چند چیدہ نعتوں سے خوشہ چینی کرتا ہوں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ظفر علی خاں اردو کے سب سے بڑے نعت گو شاعر ہیں کیونکہ ان کے کلام سے بڑھ کر کسی بھی شاعر کی نعت میں الفاظ کا شکوہ اور بندش کی چستی

نہیں ملتی۔ سادگی اور برجستگی ان کی نعتوں کا طرۂ امتیاز ہے جہاں وہ یہ کہتے ہیں:

گر ارض وسما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں، یہ نور نہ ہو سیاروں میں

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

تو وہیں بارگاہِ رسالت میں دست بستہ نغمہ سرا ہیں:

اے کہ ترا جمال ہے زینتِ محفلِ حیات
دونوں جہاں کی رونقیں ہیں ترے حسن کی زکوٰۃ

تیری جبیں سے آشکار پرتو ذات کا فروغ
اور ترے کوچہ کا غبار سرمۂ چشمِ کائنات

چہرہ کشا کرم ترا قاف سے تابہ قیروان
لطف ترا کرشمہ سنج کعبہ سے تابہ سومنات

دیکھتے ہی ترا جلال کفر کی صف الٹ گئی
جھک گئی گردنِ ہبل ٹوٹ گیا طلسم لات

بارگہِ الست سے بخش دیے گئے تجھے
سب ملکی تصرفات، سب فلکی تجلیات

چون وچگونہ وچرا، تا بکجا وتابکے
حل کئے ایک بات میں تو نے یہ سینکڑوں نکات

غیر کو خویش کر دیا، نیش میں نوش بھر دیا
پل میں درست کر دیئے، بگڑے ہوئے تعلقات

تیرے سلام کے لیے گلشنِ قدس کے طیور
گھوم رہے ہیں ڈال ڈال جھوم رہے ہیں پات پات

ظفر علی خاں کے ساتھ ہی فوراً ذہن اقبال سہیل کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کیونکہ دونوں نے ایک ہی درس گاہ سے اپنے ذہنوں کی تطہیر وتزئین کی تھی اور ایک ہی استاد مولانا شبلی نعمانیؒ سے فیوض وبرکات حاصل کی تھیں۔ دونوں کی نعتیں بھی دوش بدوش نظر آتی ہیں۔ فرماتے ہیں:

محمدؐ یعنی وہ حرفِ تخستیں کلکِ فطرت کا
محمدؐ یعنی وہ امضائے توقیعاتِ ربانی

وہ فاتح، جسکا پرچم اطلسِ زنگاریٔ گردوں
وہ امیؐ، جس کے آگے عقلِ کل طفلِ دبستانی

وہ رابط، عقل ومذہب کو کیا شیر وشکر جس نے
وہ فارق، زہد سے جس نے مٹایا داغِ رہبانی

وہ ناطق، جس کے آگے مہر بر لب بلبل سدرہ — وہ صادق، جس کی حق گوئی کا شاہد نطق ربانی

وہ عادل، جس کی میزان عدالت میں برابر ہے — غبار مسکنت ہو یا وقار تاج سلطانی

وہ جامع، جس نے یکجا کر دیے بکھرے ہوئے دانے — مٹادی جس نے آکر باہمی تفریق انسانی

وہ گنجور معارف، جسکے اک اک حرف میں پنہاں — نکات فلسفی، اسرار نفسی، راز عمرانی

وہ کشاف سرائر جس نے کھولا چند اشاروں میں — علوم اولیں وآخریں کا گنج پنہانی

جناب الیاس برنی نے جدید شعراء کی مذہبی اور نعتیہ شاعری کے بہ کثرت نمونے "معارف ملت" کی تینوں جلدوں میں جمع کر دیئے ہیں موجودہ دور کے بہت سے شعراء کے نعتیہ مجموعے منصۂ شہود پر آچکے ہیں اور نعت کو تحقیقی موضوعات میں داخل کر لیا گیا ہے جس پر بعض کتابیں بھی شایع ہو چکی ہیں، چونکہ

آبروئے ما ز نام مصطفےٰ است

اس لیے آخر میں حفیظ جالندھری کے روح پرور "سلام" کے چند اشعار نذر قارئین کرام ہیں کیونکہ سید العرب والعجم کے حضور میں سلام و درود پیش کرنا بہترین خراج عقیدت ہے

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی — سلام اے فخر موجودات، فخر نوع انسانی

سلام اے ظل رحمانی، سلام اے نور یزدانی — ترا نقش قدم ہے زندگی کی لوح پیشانی

سلام اے سرِ وحدت اے سراج بزم ایمانی — زہے یہ عزت افزائی، زہے تشریف ارزانی

سلام اے صاحب خلق عظیم، انساں کو سکھلاتے — یہی اعمال پاکیزہ، یہی اشغال روحانی

تری صورت تری سیرت، ترا نقشہ ترا جلوہ — تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی

حفیظ بے نوا بھی ہے گدائے دامن دولت — عقیدت کی جبیں تیری مروت سے ہے نورانی

ترا در ہو، مرا سر ہو، مرا دل ہو، ترا گھر ہو — تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

سلام اے آتشیں زنجیر باطل توڑنے والے — سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل

از:

جناب شیخ نذیر حسین صاحب، مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل مصر جدید کا نامور ناول نگار، مورخ اور نقاد تھا وہ ۱۸۸۸ء میں کفر غنام کے قصبہ میں پیدا ہوا۔ وہ خالص مصری نژاد تھا۔ اس کا باپ کھاتا پیتا زمیندار تھا۔ ہیکل نے ایک قرآنی مکتب میں ابتدائی تعلیم پانے کے بعد اپنی تعلیم کی تکمیل قاہرہ میں کی اور ۱۹۰۹ء میں مدرسۃ القانون (لا کالج) سے فراغت پائی۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں مصر میں بہت سی سیاسی جماعتیں سرگرم عمل ہو گئی تھیں، جن میں احمد لطفی السید کی اعتدال پسند جماعت حزب الامۃ قابل ذکر ہے۔ احمد لطفی السید، محمد حسین ہیکل کے والد کے گہرے دوست تھے، اس لیے ہیکل بھی حزب الامۃ میں شامل ہو گیا۔ احمد لطفی السید نے ہیکل کو عربی اور یورپی ادب سے روشناس کرایا، چنانچہ اس نے انگریزی پڑھنے کے بعد کارلائل کی ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ[1] (ابطال اور ابطال پرستی) کا بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کیا اور جان سٹورٹ مل اور ہربرٹ سپنسر کی تصانیف بھی گہری نظر سے دیکھیں۔ کچھ عرصے کے بعد ہیکل اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے پیرس چلا گیا، جہاں اس نے چار برس قیام کیا اور مصری قانون پر ڈاکٹریٹ حاصل

لہ HEROES AND HERO-WORSHIP

کی۔ یہاں اس نے فرانسیسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور وہ عمر بھر روسو اور طین[1] کے سیاسی افکار کا گرویدہ رہا۔

۱۹۱۳ء میں ہیکل مصر واپس آگیا اور منصورہ کے شہر میں وکالت شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قاہرہ میں آمد و رفت جاری رکھی اور وہاں کے ادباء سے بھی ملتا جلتا رہا۔ قاہرہ میں جامعۂ مصریہ قائم ہوئی تو اس کے پہلے چانسلر احمد لطفی السید مقرر ہوئے ان کی فرمائش پر ہیکل یونیورسٹی میں مصری قانون پر لیکچر دیتا رہا اور ساتھ ہی مختلف اخبارون میں مضامین بھی لکھتا رہا۔ ۱۹۲۶ء میں ہیکل نے ایک ہفتہ وار رسالہ السیاسہ شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس رسالے نے مصر کی علمی، ادبی اور سیاسی بیداری میں اہم حصہ لیا ہے۔ ہیکل کو تعلیم و تدریس اور وکالت سے چنداں دلچسپی نہ تھی، اس لیے وہ ایک اعتدال پسند سیاسی جماعت حزب الدستور میں شامل ہو کر ہمہ تن سیاست میں حصہ لینے لگا۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں وفد پارٹی کی وزارت برخاست ہو کر محمود پاشا کی وزارت قائم ہوئی تو ہیکل وزیر تعلیم مقرر ہوا اور اسے پاشا کا خطاب ملا۔ وزارت سے فراغت کے بعد وہ تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گیا۔

ہیکل ایک کامیاب مصنف تھا۔ اس کا اہم ترین ناول زینب ہے، جو اس نے پیرس کے قیام اور لندن اور سوئٹزرلینڈ کی سیاحت کے دوران لکھا تھا اور ۱۹۱۳ء میں مصری فلاح کے فرضی نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ ایک مصری کسان کی بیٹی کی کہانی ہے، جو ایک روسی کاشتکار سے محبت کرتی ہے، لیکن اس کا باپ اس کی مرضی کے برعکس اسکی شادی کسی دوسری جگہ کر دیتا ہے اور بے چاری لڑکی سل و دق سے گھل گھل کر مرجاتی

[1] طین TAINE (۱۸۲۸ء۔ ۱۸۹۳ء) ایک فرانسیسی فلاسفر اور ناقد ادب

ہے۔ یہ ناول مصری کسانوں کی زندگی، ان کی بدحالی اور معاشی پامالی کا ترجمان ہے۔ بقول محمود تیمور یہ ناول جلد ہی نئے لکھنے والوں کا قبلہ اور کعبہ بن گیا۔ ناول کے مکالمے عامی زبان میں لکھے گئے ہیں اور بحیثیت مجموعی زبان سادہ اور بے معنی لفاظی سے پاک ہے۔ اس ناول کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ فلمایا بھی جا چکا ہے۔ ہیکل نے بہت سے افسانے بھی لکھے ہیں جو اوقات الفراغ کے نام سے شائع ہوئے۔ ادبی مقالات کا مجموعہ ثورۃ الادب کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔

قصے، کہانیاں اور ادبی مقالات لکھتے لکھتے ہیکل پر یکایک ایک روحانی انکشاف ہوا کہ وہ غلط راستے پر جا رہا ہے۔ اس روحانی تجربے کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے

"میں نے عمر بھر اپنے ہم وطنوں کو یورپی تہذیب و تمدن اختیار کرنے کی دعوت دی ہے اور فرعونی عہد کی تاریخ کے واقعات سنائے ہیں، لیکن اب میرا پختہ یقین ہے کہ مصریوں کی صلاح و فلاح اور ان کا مستقبل تاریخ اسلام کے جان بخش واقعات سے وابستہ ہے (فی منزل الوحی، ص ۲۳)

اس کے بعد ہیکل نے تاریخ اسلام کے زریں عہد کے مشاہیر کی سیرت نگاری کو اپنی زندگی کا محور بنا لیا۔

ہیکل کا اہم ترین علمی کارنامہ حیات محمد (صلعم) ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح ہے۔ اگرچہ کتاب میں عقلیت پسندی کی کہیں کہیں جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی ہیکل نے اسلام کا دفاع کیا ہے اور سیرت پاک پر عیسائی اور مغربی مصنفین کے جواب بھی دیئے ہیں۔ نفس مضمون اور بحث و استدلال کے اعتبار سے حیات محمدؐ کسی حد تک سر سید احمد خاں مرحوم کی کتاب خطبات احمدیہ سے ملتی جلتی ہے۔

فاضل مصنف کا انحصار زیادہ تر سیرت ابن ہشام پر رہا ہے۔ اس کتاب کا انگریزی فارسی اور اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ابھی تک اس کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا۔

ہیکل نے خلفائے ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکر الصدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے بھی سوانح حیات لکھے ہیں اور وہ بڑے مقبول ہوئے ہیں، اگرچہ اردو میں مولانا شبلیؒ کی کتابیں (سیرت النبیؐ اور الفاروق) اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تصانیف (ابوبکر الصدیقؓ اور عثمان غنیؓ) دینی مصادر و مآخذ پر دسترس، گہری علمی تحقیق اور اثر انگریزی کے اعتبار سے ہیکل کی کتابوں سے فزوں تر ہیں اور اسلامی ہند کا مایۂ ناز علمی کارنامہ ہیں اس کا سفرنامہ حج، فی منزل الوحی آج بھی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

ہیکل ناقد ادب بھی تھا۔ وہ نقد الادب کے بارے میں فرانسیسی ادیبوں خاص کر طین سے متاثر تھا۔ ہیکل نے اپنی زندگی کا آغاز ایک قوم پرست اور وطن پرور ادیب کی حیثیت سے کیا تھا۔ لیکن اس کا خاتمہ مورخ اسلام اور عربی اسلامی تہذیب و تمدن کے داعی اور ترجمان کی صورت میں سنہ ۱۹۵۶ء میں ہوا۔

فارم ۴ / ۱۷
دیکھو رول نمبر ۸
معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت : دار المصنفین اعظم گڈھ	پتہ : دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت : ماہانہ	نام پبلشر : " " "
نام پرنٹر : عتیق احمد	اڈیٹر : ضیاء الدین اصلاحی
قومیت : ہندوستانی	قومیت : ہندوستانی

نام و پتہ مالک رسالہ : دار المصنفین اعظم گڈھ
میں عتیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں عتیق احمد

اخبارِ علمیہ

قرآن مجید کی طباعت و اشاعت کو مسلم ان حکومتوں اور اداروں نے ہمیشہ اپنا ایک مبارک فریضہ خیال کیا ہے، موجودہ زمانہ میں سعودی حکومت اس سلسلہ میں قابل رشک خدمت انجام دے رہی ہے، سنہ ۱۴۰۵ھ سے ۱۴۰۹ھ تک چار برسوں میں اس نے ساڑھے ۳۱ ملین کی تعداد میں قرآن مجید اور اس کے مختلف زبانوں میں تراجم طبع کر کے تقسیم کیا ہے، ان میں ساڑھے بائیس ملین نسخے ایشیا میں، چار ملین افریقہ میں، ۱۶۶ ہزار یورپ ۱۰۵۱۲۷ نسخے امریکا اور چھ ہزار آسٹریلیا میں تقسیم کیے گئے، ان کے علاوہ دنیا بھر کی مختلف نمائشوں کے لیے ۴۸۶۱۴۶ نسخے پیش کیے گئے، حجاج کرام کو بھی بطور تحفہ ساڑھے تین ملین مصاحف دیے گئے رابطہ عالم اسلامی نے بھی نیروبی کے اسلامی اداروں کو ایک ہزار چار سو اسی (۱۴۸۰) اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں مراکش کی مسجد طاطا کے لیے قرآن مجید کا تحفہ پیش کیا ہے، ادھر بنکاک تھائی لینڈ کے اسلامی امور کے ادارہ نے قرآن مجید کا ترجمہ تھائی زبان میں تیار کر لیا ہے، اس کی اشاعت کے لیے تھائی لینڈ کی حکومت نے تعاون کا اعلان کیا ہے، روس کے دینی اداروں کی فرمائش پر اردن کی حکومت نے بھی قرآن مجید کے ایک لاکھ نسخوں کا ہدیہ ارسال کیا ہے

آذربائیجان، سوویت روس کی ان مسلم ریاستوں میں سے ایک ہے جو روسی کمیونسٹوں کے سیاسی اور فکری قبضہ و تسلط میں ہیں، ایک دور وہ تھا جب وہاں مسجدیں مقفل کر دی گئی تھیں، سمرقند کی جامع مسجد کا منارہ منہدم کر کے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہ ایک مٹتے ہوئے نظام کا اعتراف شکست ہے، مگر آج فلسفہ مادیت اور اشتراکیت خود مرحلۂ فنا میں ہے، چنانچہ اسی آذربائیجان میں اب پہلی بار قرآن مجید کو آذربائیجانی زبان کے ترجمے کے ساتھ شایع کیا گیا ہے، وہاں کے مسلم بورڈ نے

ہ پچاس ہزار کی تعداد میں یہ نسخے شایع کیے ہیں، آذربائیجان کے مفتی نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ راجدھانی باکو میں ۷۰ برس کے بعد قرآن مجید کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا گیا ہے، بورڈ کے چیرمین شیخ اللہ شکور پاشازادہ نے سوویت ٹیلی ویژن سے ایک ملاقات میں آذربائیجانی مسلمانوں کی اس خواہش کا بھی ذکر کیا کہ انھیں قم، مشہد اور نجف کی زیارت کی اجازت دی جائے اور ان شہروں میں اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے طلبہ کو سفر کی اجازت و سہولت فراہم کی جائے۔

قرآنیات سے متعلق مغربی جرمنی کے چانسلر رچرڈ وائٹسکر کا یہ قول بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید تنہا وہ آسمانی کتاب ہے جو علم جنین کی صحیح تفسیر کرتی ہے، مغربی جرمنی کی یونیورسٹیوں کے نمائندہ طلبہ سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سائنسداں اس علم کی تشریح و توضیح میں ناکام رہے ہیں۔

ایک خبر یہ بھی ہے کہ سینٹ پال کی کیتھولک چرچ سوسائٹی، قرآن مجید کی ترجمانی کے لیے ویڈیو کیسٹس اور تعلیمی کارٹون فلمیں تیار کر رہی ہے، یہ یقیناً ایک نئے فتنہ کا پیش خیمہ ہے، ڈیلی ٹیلی گراف کے مطابق شروع میں یہ فلمیں صرف مسلم مارکٹ میں پیش کی جائیں گی، ستم یہ ہے کہ ان کی تیاری میں قاہرہ یونیورسٹی کے بعض اساتذہ کا تعاون بھی شامل ہے۔

رشاد خلیفہ، امریکا کی ایک مسجد کے امام ہیں، چند برس پہلے انھوں نے ۱۹ کے ہندسہ کے ذریعہ قرآن مجید کے عددی معجزہ کو پیش کیا تھا، بظاہر یہ انوکھی تحقیق تھی مگر آخر علماء نے اس کی تہہ میں بہائی افکار و معتقدات کی جھلک دیکھ لی، اب ان ہی رشاد خلیفہ نے نعوذ باللہ اپنی رسالت کا اعلان کر دیا ہے، انکا کہنا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی تو ہیں، آخری رسول نہیں، کیونکہ قرآن مجید کے الفاظ ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین سے یہی ظاہر ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ مولیٰ عز وجل نے انکو سینکڑوں قرآنی براہین اور مادی و حسابی دلائل ایسے دیے ہیں جنکی وجہ سے وہ اس دور کے "رسول میثاق" ہیں، سلمان رشدی کے بعد اب رشاد خلیفہ، طریق رشد کے بجائے راہ ضلالت پر گامزن ہیں اور قرآن مجید کے اس دعویٰ کے مصداق بھی ہیں کہ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ، یہ سطریں لکھی جا چکی تھیں تو معلوم ہوا کہ وہ امریکا کی ایک مسجد میں مردہ پائے گئے۔

ایسی ہی ایک مثال لیبیا کے صدر معمر قذافی کی شخصیت ہے جو ژولیدگی افکار سے عبارت ہے، حال ہی میں انھوں نے

مسئلہ خلافت کے متعلق لب کشائی کی اور فرمایا کہ اگر مسلمانوں نے احیائے خلافت کی کوشش کی تو ایک مرتبہ پھر گوناگوں فلسفیانہ افکار و نظریات کی گرم بازاری ہوگی، قدیم فقہی کتابوں اور حافظ ابن تیمیہؒ کا مطالعہ ضروری ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے باہمی تنازعات میں اور اضافہ ہوگا، انکے خیال میں خلافت، حضرت علیؓ کے دور حکومت کے ساتھ ہی ختم ہوگئی، اس کے بعد کا دور مطلق ملوکیت کا رہا، رہی عثمانی خلافت تو یہ محض اسلامی دنیا پر تسلط کا ایک بہانہ تھی خلافت کے نام سے جو کوششیں ہوئیں ان کا مقصد اسلامی دنیا کا استحصال اور قوت و اقتدار اور غلبہ و تسلط کا حصول تھا۔

فکری پراگندگی اور عہدہ و منصب کے غلط استعمال کی مثالیں اور بھی ہیں چنانچہ ہندوستان کے سابق کانگریسی وزیر داخلہ مسٹر بوٹا سنگھ کے ایک انٹرویو کے چند اقتباس معاصر امپیکٹ انٹرنیشنل میں دیکھ کر حیرت ہوئی، انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ اجودھیا میں رام مندر کے سلسلہ میں انکا رویہ وشو ہندو پرشد کے ساتھ ہمدردانہ تھا، انھوں نے کہا کہ "جب یہ سارا قضیہ میرے سامنے آیا تو میں اس جذبہ کو دبا نہ سکا کہ سکھوں کے دسویں گرو، گوبند سنگھ نے اجودھیا میں رام مندر بنانے کی کوشش کی تھی مگر انکی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی تھی اس لیے اگر میں اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکا تو یہ میرے لیے دنیا اور مابعد دنیا کے لیے ایک توشہ ہوگا، میں شروع سے اسی جذبہ کے تحت اس قضیہ سے دلچسپی لے رہا تھا"، انھوں نے یہ بھی کہا کہ مندر کا سنگ بنیاد وہیں رکھا گیا، جہاں وشو ہندو پرشد والے رکھنا چاہتے تھے۔

غیر اسلامی قوتوں کے علی الرغم اسلام کا ابر کرم، سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برستا ہے، انڈونیشیا میں عیسائی مشنریوں کا سیلاب یقیناً بلاخیز ہے مگر وہاں کے غیر مسلم قبائل مسلسل اسلام کے دامن میں پناہ لیتے جاتے ہیں، ابھی قبیلہ ڈایاک کے ۱۶۱ افراد نے اسلام قبول کیا، اس سے پہلے سیمواک شہر کے لوگوں نے اجتماعی طریقہ سے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تھا، سوڈان میں مسلمان عالموں سے مناظرہ کے بعد پانچ نامور عیسائی پادریوں نے بھی اسلام قبول کر لیا، مغربی سوڈان کے کردوان علاقہ میں ۴۶۶ لوگوں نے اجتماعی طور پر قبول اسلام کی خوشخبری دی۔

ع۔ص

وفیات

مولانا مفتی حافظ محمد رضا انصاری فرنگی محلی

از

حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

افسوس ہے کہ مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی کا ۵ر فروری کو لکھنؤ میں انتقال ہوگیا، عمر تقریباً ۷۰ برس کی تھی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

خانوادہ فرنگی محل گزشتہ تین سو برس سے ہندوستان میں علم و عمل کی شمع روشن کیے ہوئے ہے، اس خاندان میں علم کی دولت جس طرح محفوظ رہی اور نسلاً بعد نسل اس میں جس قدر اضافہ ہوتا گیا، ہندوستان میں چند خاندانوں کے علاوہ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، ملّا قطب الدین شہیدؒ کے فرزند استاذ الہند ملا نظام الدین محمد بانی درس نظامیہ کے بعد ملا حیدرؒ، ملا مبین، ملا حسن، مولانا عبد العلی بحر العلوم، مولانا عبد الحئی اور مولانا عبد الباری اسی خاندان کے سلسلۃ الذہب کی روشن مثالیں ہیں، بقول علامہ شبلیؒ "لکھنؤ کا فرنگی محل علم و فن کا معدن بن گیا، آج جہاں علوم عربیہ کا نام و نشان باقی ہے، اسی خاندان کا یہ توفیض ہے، ہندوستان کے کسی گوشہ میں جو شخص تحصیل علم کا احرام باندھتا ہے اس کا رخ فرنگی محل کی طرف ہوتا ہے۔"

ہمارے عہد میں مفتی محمد رضا انصاری مرحوم اپنے اسی نامور خاندان کی علمی و تہذیبی روایتوں کے وارث تھے، انکے والد مولوی محمد سخاوت اللہ، مدرسہ عالیہ نظامیہ میں ریاضی کے استاد تھے، بعد میں وہ حیدرآباد دکن میں محکمہ امور عامہ میں ملازم ہوئے، ان کی عدم موجودگی میں مفتی صاحب مرحوم کی تعلیم و تربیت ان کے رشتہ کے چچا مفتی محمد عبد القادرؒ کی زیر نگرانی ہوئی جو علم و عمل میں

اپنے اسلاف کرام کا نمونہ تھے اور جن سے شاہ معین الدین ندوی مرحوم نے بھی مختصر المعانی کا درس لیا تھا۔

مفتی صاحب مرحوم کی بسم اللہ مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ نے کرائی تھی، خاندانی روایت کے مطابق سب سے پہلے حفظ قرآن کی دولت سے سرفراز ہوئے، پھر معقولات و منقولات کا علم مفتی محمد عنایت اللہ، مولانا محمد قطب الدین، مولانا محمد صبغۃ اللہ شہید، مولانا سید علی زینبی، مولانا سید علی نقی مجتہد اور ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی کاکوروی وغیرہ سے حاصل کیا۔

لکھنؤ میں اردو صحافت کا آغاز ہوا تو فرنگی محل کے خانوادہ نے بھی اس سے دلچسپی لی، مفتی صاحب کی زندگی کی ابتدا بھی صحافت سے ہوئی سنہ ۳۹ء میں ماہنامہ نیا ادب لکھنؤ سے شائع ہوا تو اس کی مجلس ادارت میں سید سبط حسن، مجاز اور علی سردار جعفری کے ساتھ وہ بھی شریک تھے، بعد میں سنہ ۴۳ء میں فرنگی محل سے نیا ادب کے انداز پر ایک رسالہ منزل نکالا سنہ ۴۶ء میں وہ روزنامہ ہمدم سے متعلق ہوئے سنہ ۴۷ء میں یہ بند ہوا تو سنہ ۴۸ء میں وہ روزنامہ قومی آواز سے وابستہ ہوئے اور تقریباً بیس برس تک اس سے وابستہ رہے، اس میں جدید مطبوعات پر تبصرے انہی کے قلم سے شائع ہوتے تھے جو علمی و ادبی حلقوں میں بہت پسند کیے جاتے تھے، سنہ ۶۰ء میں وہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں استاد مقرر ہوئے، وہاں سے سبکدوش ہوئے تو کچھ عرصہ کے لیے یوپی اردو اکیڈمی کے چیرمین بھی رہے۔ گو ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ صحافت و تدریس میں گزرا لیکن اس میں بھی وہ تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکال لیتے تھے، سنہ ۷۶ء میں انجمن ترقی اردو نے ان کی کتاب "ادب جاہلی" شائع کی جو ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب الادب الجاہلی کا ترجمہ ہے، سنہ ۷۵ء میں ان کی کتاب مجذوب اور ان کا کلام شائع ہوئی جس کے حسن ترتیب اور خوش سلیقگی کی بڑی داد ملی، شاہ معین الدین مرحوم نے اسے "انتخاب لاجواب" قرار دیا، سنہ ۶۵ء میں اپنے مربی و مشفق چچا مولانا مفتی عبد القادر فرنگی محلی

کے فتاویٰ کا مجموعہ مرتب کرکے فتاویٰ فرنگی محل موسوم بہ فتاویٰ قادریہ کے نام سے شایع کیا، اس سے پہلے انھوں نے مفتی عبدالقادر مرحوم کی یاد میں 'مفتی صاحب' کے نام سے ایک کتاب بھی شایع کی تھی، سنہ ۶۵ء میں ان کو فریضۂ حج کی سعادت نصیب ہوئی، واپس ہوئے تو قومی آواز میں اپنا سفرنامہ لکھا، بعد میں یہ 'حج کا سفر' کے نام سے کتابی صورت میں طبع ہوا، جولائی سنہ ۷۰ء سے مارچ سنہ ۷۱ء تک ملا نظام الدین محمد پر ان کا مقالہ معارف میں مسلسل شایع ہوا، اس سلسلہ کو مرتب کرکے انھوں نے 'بانی درس نظامی' کے نام سے سنہ ۷۳ء میں شایع کیا یہ کتاب تحقیق، ترتیب، محنت اور دیدہ ریزی کا عمدہ نمونہ ہے، معارف میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا کہ "لایق مصنف نے اپنے خاندان کی محفوظ دستاویزوں، قدیم یادداشتوں اور مخطوطات کے علاوہ بعض دوسرے مآخذ کی مدد سے یہ کتاب سلیقہ سے مرتب کی ہے، واقعات کی تحقیق اور چھان بین میں بڑی کاوش سے کام لیا گیا ہے اس کے لیے وہ مشرقی علوم کے قدردانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں"، معارف میں انکے اور مضامین بھی شایع ہوئے جن میں مولانا محمد یوسف فرنگی محلی اور علمائے فرنگی محل کے شجرۂ نسب پر ایک نظر، علمی حلقہ میں قدر کی نظر سے دیکھے گئے، ان کی آخری تصنیف 'تذکرہ حضرت سید صاحب بانسویؒ' کی بھی بڑی پذیرائی ہوئی، خاندان فرنگی محل تین صدیوں سے سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کے سلسلہ عالیہ قادریہ رزاقیہ سے وابستہ رہا ہے، مفتی صاحب مرحوم نے لکھا کہ "علمائے فرنگی محل کی تین سو سالہ تاریخ کا آغاز اگرچہ بظاہر استاذ الہند ملا نظام الدین فرنگی محلی اور ان کے مرتبہ درس نظامی سے ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس خاندان کی علمی سربلندی اور تدریسی سربراہی کا سرچشمہ ایک "امی سید نہادہ والا تبار" کے آستانہ سے پھوٹا ہے پوری کتاب اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

ان کو شعر و ادب کا اچھا اور ستھرا ذوق تھا، ابتدا میں ترقی پسند تحریک سے بھی ان کا تعلق رہا، نقوش کے شخصیات نمبر میں مجذوب اور انتخاب کلام حسرت موہانی میں حسرت موہانی پر ان کے مضامین سے انکے عمدہ و شستہ ادبی ذوق کی جھلک صاف نمایاں ہے۔

حسن اخلاق، شرافت، مروت، دردمندی، سادگی اور زندہ دلی میں وہ فرنگی محل اور لکھنؤ کی دیرینہ تہذیب کے نمایندہ اور نمونہ تھے، عقیدہ و عمل میں متقشف نہیں تھے لیکن دینی شعائر کا احترام ان کے ہر عمل سے ظاہر تھا، فتاویٰ قادریہ کا مقدمہ انھوں نے سفر حج کے دوران لکھا تو بڑے جذب و کیف کے ساتھ یہ تحریر سپرد قلم کی کہ "عجب خوش بختی ہے کہ جس وقت یہ سطریں لکھی جارہی ہیں حرم نبویؐ کا خوش الحان موذن جمعہ کی اذان کہتے ہوئے اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللّٰہ کی صدا بلند کر رہا ہے:

جان رگ رگ سے کھنچی آتی ہے کانوں کیطرف ـــــ کس قیامت کی کشش اف تری آواز میں ہے"

دارالمصنفین سے ان کا بڑا گہرا تعلق تھا علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور دونوں کے علمی پایہ سے بخوبی واقف تھے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی بیشتر تعلیم فرنگی محل میں ہوئی تھی اس لحاظ سے یہاں کے تمام لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، وہ مفتی صاحب مرحوم سے بھی عزیزانہ تعلق رکھتے تھے اور ان کے مضامین کو معارف میں دلچسپی سے شایع کرتے تھے وہ یہاں جب بھی آتے ہر شخص پر اپنی محبت کے نقوش چھوڑ جاتے، سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم ان سے خاص تعلق اور معاملہ شفقت رکھتے تھے وہ لکھنؤ جاتے تو وقت نکال کر فرنگی محل ان سے ملنے ضرور جاتے، سید صاحب مرحوم کا سفر آخرت بھی ندوۃ العلما سے فرنگی محل جاتے ہوئے ہوا ان کے ہمراہ سید شہاب الدین دسنوی صاحب بھی تھے کہ ڈالی گنج کے پل پر وفات کا حادثہ پیش آیا، اس سے ایک ہی روز قبل مفتی صاحب مرحوم پاکستان کے لیے روانہ ہوئے تھے اور ابھی وہ دلی ہی میں تھے کہ ان کو یہ خبر ہوئی اپنے

تعزیت نامہ میں لکھا کہ "ایسے شفیق بزرگ کا ان حالات میں ہمارے درمیان سے اٹھ جانا کس قدر دلخراش صدمہ ہے، میرے لیے ایک اور ایک ہی ایسا بزرگ اٹھ گیا جو محبوب بھی تھا اور شفیق بھی" اس قحط الرجال میں مفتی صاحب مرحوم جیسے صاحب علم و کمال کا اٹھ جانا ایک بڑا سانحہ اور مذہب، علم اور تہذیب کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، فرنگی محل میں ان کی کمی عرصہ تک محسوس کی جائے گی، اب سے تقریباً سو سال پہلے علامہ شبلیؒ نے ملا نظام الدینؒ کے اسی آستانہ کی زیارت کی تھی تو فرمایا تھا کہ "اللہ اکبر ہمارے ہندوستان کا کیمبرج یہی ہے، یہی خاک ہے جس سے عبد العلی بحر العلوم اور ملا کمال پیدا ہوئے، افسوس اب یہ کعبہ ویران ہوتا جاتا ہے" مفتی صاحب کی وفات سے اس کعبہ علم کی ویرانی اور بڑھ گئی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور فرنگی محل کے کعبہ علم و فن کو پھر سے آہوان علم نبوت سے آباد کردے۔ آمین

آہ! جناب مولوی حافظ محمد منصور نعمانی ندوی مرحوم

دار العلوم تاج المساجد بھوپال کے استاد جناب مولوی سید شرافت علی ندوی کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ دار المصنفین کے سابق رفیق مولوی منصور نعمانی ندوی صاحب کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے ۱۶ فروری کو بھوپال میں انتقال ہوگیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ان کا سانحہ وفات انکے والدین، اعزہ اور احباب کیلئے نہایت سخت اور اندوہناک ہے، بظاہر وہ توانا، متحرک، چاق و چوبند اور صحتمند تھے، بیماری دل کا تو شبہ بھی نہ تھا، اپنے خانگی مسائل سے فکرمند ضرور تھے مگر کسے پتہ تھا کہ رخت سفر سمیٹنے میں ایسی عجلت کریں گے ؎ آہ

کتنی مشکل زندگی ہے! کس قدر آساں ہے موت

وہ ندوہ کے باصلاحیت فرزندوں میں تھے، تعلیم کے دوران ہی انکی صلاحیتیں ظاہر ہونے لگی تھیں چنانچہ اسی زمانہ میں انکے مراسلے صدق جدید میں بار پانے لگے تھے، وہ ندوہ کی انجمن الاصلاح کے ناظم ہوئے تو انکے

دور نظامت میں رشید احمد صدیقی مرحوم نے وہ اہم توسیعی خطبہ دیا جسے عزیزان ندوہ کے نام سے شایع کیا گیا۔ حصول تعلیم کے بعد وہ تاج المساجد میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے، ساتھ ہی نشان منزل کے علاوہ مدیر بھی رہے، انکی سعی اور تدبیر سے اسکا معیار بلند ہوا، ۸۲ء میں وہ دار المصنفین کے رفیق کی حیثیت سے تشریف لائے یہاں انھوں نے حافظ سخاوی، شیخ عبد القادر عیدروس اور حافظ سخاوی کی تصانیف جیسے علمی مقالے سپرد قلم کیے، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کی بعض اہم فروگذاشتوں پر انھوں نے جس دقت نظری سے توجہ دلائی اس کا وزن محسوس کیا گیا، بعض اسباب کیوجہ سے وہ یہاں زیادہ دنوں قیام نہ کر سکے اور تلاش معاش میں سعودی عرب چلے گئے، وہاں سے واپس آنے کے بعد بھوپال میں ہی مستقل قیام رہا، رہین ستم ہائے روزگار ہونے کے باوجود انھوں نے قلم و قرطاس سے اشتغال قائم رکھا مقامی اخبارات میں برابر لکھتے رہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ پر بھوپال میں جو سمینار ہوا، اس میں انھوں نے بڑی محنت کی، اور ایک نہایت کامیاب شعری نشست کا انعقاد کیا، بھوپال کے عالموں، ادیبوں اور شاعروں سے انکے اچھے روابط تھے، ادھر بھوپال میں نواب سید صدیق حسن خاں کی علمی یادگار قائم کرنے کے لیے فکرمند تھے، وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، خوش دل اور خوش مزاج تھے، طبیعت میں تواضع، انکسار اور حد درجہ سادگی بلکہ بھولا پن تھا، دوسروں کی خدمت میں لذت محسوس کرتے، مہمان نوازی تو ان کے پورے خاندان کا نمایاں وصف ہے، مگر وہ اس میں کچھ سوا ہی تھے، تحفے تحائف دینے میں بھی بڑی فیاضی کا ثبوت دیتے، ابھی ٹھیک ایک مہینہ قبل جب ان سے رخصت ہو کر آیا تھا تو کسے خبر تھی کہ اس سراپا پیکر اخلاص کی اس عالم ناسوت میں یہ آخری دید ہے، زندگی انھوں نے حوصلے سے گزاری، انکی موت بھی قابل رشک رہی جمعہ کے دن ٹھیک نماز جمعہ سے پہلے مسجد میں وہ سنتیں ادا کر رہے تھے عین اسی حالت میں وہ وصال رب سے ہمکنار ہوئے، ان کی جواں مرگی ان کی اہلیہ، چھوٹے چھوٹے بچوں، والدہ اور خاص طور سے انکے والد ماجد مولانا محمد نعمان خاں ندوی مدظلہ کیلئے یقیناً جانگسل صدمہ ہے لیکن جس آن سے وہ اس جہان فانی سے رخصت ہوئے وہ باعث تسکین بھی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اس معصوم صفت بندہ کے درجات بلند فرمائے، زندگی کی دشوار گزار راہوں میں انکی اہلیہ اور بچوں کی اپنے فضل خاص سے دستگیری فرمائے، جن کے پاس ع اک متاع دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مطبوعاتِ جدیدہ

اتر پردیش اردو اکاڈمی کا سلسلۂ ابوالکلام صدی تقریبات

سنہ ۸۸ء و ۸۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی صد سالہ تقریبات پورے ملک میں منائی گئیں، لیکن مولانا کو مخلصانہ خراج عقیدت پیش کرنے میں اتر پردیش اردو اکاڈمی زیادہ نمایاں رہی، اس میں اس وقت کے لائق چیرمین پروفیسر محمود الٰہی صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کے ذوقِ علم وادب، جذبۂ عمل، حسن انتظام اور مولانا سے انکی والہانہ عقیدت و شیفتگی کو زیادہ دخل تھا، اکاڈمی نے مولانا کا نام جریدۂ عالم پر ثبت کرنے اور انہیں بقائے دوام کے دربار میں جگہ دینے کے لیے ان کی شخصیت، افکار اور تعلیمات کو عام کرنے کا فیصلہ کیا، اس سلسلہ میں اس نے مولانا کے شہرۂ آفاق جریدۂ الہلال کی مکمل فائل اور ان سے متعلق بعض کتابوں کے انتخابات شایع کیے، اس کا یہ سلسلہ مبسوط تبصرہ کا متقاضی تھا، لیکن اس میں تاخیر ہوتی اس لیے سردست مختصر تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

الہلال (۱) جلد اول و دوم
الہلال (۲) جلد سوم و چہارم
الہلال (۳) جلد پنجم، ششم، ہفتم

مولانا آزاد صدی تقریبات کے موقع پر الہلال کے تمام شماروں کے عکس کی اشاعت اکاڈمی کا سب سے اہم کارنامہ ہے، یہ کام پاکستان میں ہو چکا تھا لیکن ہندوستان کے ذمہ ابھی یہ قرض باقی تھا جس کو پروفیسر محمود الٰہی سابق چیرمین اتر پردیش اردو اکادمی نے بڑے عزم و حوصلہ کے ساتھ ادا کیا ہے، الہلال کی مکمل فائل تین مجلدات میں اس طرح شایع کی گئی

ہے کہ پہلی میں دو جلدیں ہیں شروع میں ۱۳ جولائی سے ۲۵ دسمبر سنہ ۱۹۱۲ء تک کے ۲۳ شمارے اور آخر میں ۸ جنوری سے ۲۵ جون سنہ ۱۹۱۳ء تک کے ۲۴ شمارے شامل ہیں، دوسری میں بھی دو جلدیں ہیں جو سنہ ۱۹۱۳ء کی دوسری شش ماہی اور سنہ ۱۹۱۴ء کی پہلی ششماہی کے شماروں پر مشتمل ہے، تیسری کی تین جلدیں ہیں پہلی میں یکم جولائی سے ۱۸ نومبر سنہ ۱۹۱۴ء تک کے الہلال کے ۱۸ شمارے دیئے گئے ہیں، دوسری میں البلاغ ۱۲ نومبر سنہ ۱۹۱۵ء سے ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء کے گیارہ شمارے اور تیسری میں الہلال کے دوسرے دور ۱۰ جون سنہ ۱۹۲۷ء سے ۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ء تک کے ۲۴ شمارے درج ہیں کل شمارے ۱۳۶ ہیں جن کے صفحوں کی مجموعی تعداد ۴۰۵۸ ہے، تصویروں اور ہر ششماہی کی فہرست کا عکس بھی اس کے شروع یا آخر میں دیا گیا ہے۔ ہر ہر جلد کی ابتدا میں فاضل مرتب کا پیش لفظ بھی ہے پہلی جلد کے شروع میں معنویت سے پُر ایک فاضلانہ مقدمہ ہے اس میں الہلال کی عظمت و بلند پائیگی مختلف پہلوؤں سے دکھائی گئی ہے اور مولانا کے اسلوب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی حیثیت بیت الغزل کی ہے، یہ مقدمہ خود پروفیسر محمود الٰہی کی رعنائی تحریر و بیان کا دلکش نمونہ ہے جلدوں میں کہیں کہیں صفحوں کی غلطی بھی نظر آئی اور فہرست و متن دونوں میں ایک ایک جگہ احتساب کو استصاب لکھا گیا ہے۔

آگے انتخابات کا تعارف ہے، ان سب کا سائز متوسط اور کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ ہے سرورق سادہ مگر جاذبِ نظر ہے صفحات اور قیمت مختلف ہے جس کی صراحت کر دی گئی ہے، یہ سب کتابیں اکادمی کے پتہ سے ملیں گی۔ الہلال کی تینوں جلدوں کی قیمت چھ سو روپئے ہے،

انتخاب غبار خاطر:۔ مرتبہ پروفیسر محمود الٰہی صفحات ۱۱۲، قیمت ۲ روپیے۔

اس میں مولانا کی مشہور و مقبول کتاب غبار خاطر سے ۹ منتخب خطوط شایع کیے گئے ہیں، یہ سب خطوط بعینہٖ شایع کیے گئے ہیں، اور انتخاب میں صرف خطوط کی تعداد کم ہو گئی ہے مگر عجلت کی

وجہ سے بعض جگہ متن سے انتخاب کی مکمل مطابقت نہیں پائی جاتی، ذیل کے نقشے سے اس کی وضاحت ہوگی۔

غبار خاطر مرتبہ مالک رام کا اصل متن	انتخاب کی عبارت
اس راہ میں کانٹوں کا دامن سے الجھنا مخل نہیں ہوتا (ص۱۶)	اس راہ میں کانٹوں سے الجھنا مخل نہیں ہوتا (ص۱۲)
اور خوش رہتا ہوں (ص۶۷)	اور خوش گوار رہتا ہوں (ص۶۳)
یہ سچ ہے (ص۷۶)	یہ درست ہے (ص۷۱)
اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا (ص۲۴)	تمام ساتھیوں کو اس کا ساتھ دینا پڑا (ص۲۲)
نقل لامنی - اتبکی (ص۲۴۲)	نقالامنی - ابتلی (ص۷۹)

کہیں کہیں انتخاب میں پیراگراف نمایاں نہیں ہے، شروع میں فاضل مرتب کا پیش لفظ ان کی تحریر کی سلاست و شگفتگی کا نمونہ ہے مگر عجلت کی وجہ سے اس کی بھی مکمل تصیح نہیں ہوسکی ہے، اس کا اندازہ بھی نقشۂ ذیل سے ہوگا۔

غلط	صحیح	غلط	صحیح
دوقدمی (ص۵ دوجگہ)	دو قدمی	کیونکہ ان کی تسوید (ص۶)	... اس کی تسوید
ذہن کی لذت اندازی عطا	... لذت اندوزی	غبار خاطر کی وصول یابی	... مولانا کا تحریر....
		پر مولانا تحریر فرماتے ہیں (ص۱)	

پیش لفظ میں مولانا کی عظمت، ان کی اسیری کی روداد، مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے ربط خاص پر گفتگو کی گئی ہے اور غبار خاطر کے متعلق تاثرات ظاہر کیے گئے ہیں، لیکن انتخاب میں جو اصول ملحوظ رکھے گئے ہیں اور جن خطوط کو چھوڑ دیا گیا ہے اس کی کوئی وجہ نہیں بیان کی گئی ہے۔

انتخاب ہفتہ وار پیغام :- مرتبہ پروفیسر محمود الٰہی، صفحات ۱۱۲ قیمت آٹھ روپے۔

ہفتہ وار پیغام ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء سے ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء تک مولانا ابوالکلام آزاد کی سرپرستی اور ان کے رفیق کار مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں شایع ہوتا رہا، اس زمانہ میں مولانا کی سیاسی مشغولیتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور وہ تحریک خلافت میں سرگرم حصہ لے رہے تھے اس لیے ان کے لیے ادارت کی ذمہ داری نباہنا ممکن نہیں تھا، انتخاب میں مولانا کے مضامین تحریریں اور بیان بھی شامل ہیں اور دوسروں کے بھی۔ آخر میں اخبار کے تمام شماروں کے مشمولات کی مکمل فہرست اور شروع میں سرورق کا عکس بھی شایع کیا گیا ہے، دیباچہ میں مولانا اور ان کے رفیق مولانا ملیح آبادی کے تعلقات اور پیغام کی اہمیت و بلند پایگی کا ذکر ہے۔

انتخاب تذکرہ :- مرتبہ پروفیسر محمود الٰہی، صفحات ۴۴۴ قیمت ۱۲ روپے۔

اس انتخاب میں مولانا کی مشہور و مقبول کتاب تذکرہ کے وہ حصے شامل ہیں جن میں انھوں نے اپنے سوانحی حالات تحریر فرمائے ہیں، دوسرے مشمولات کو حذف کر دیا گیا ہے، شروع میں فضل الدین احمد مرحوم کا مبسوط مقدمہ اور مولانا کا اعتذار بھی دیا گیا ہے اور آخر کے ضمیموں میں مولانا کی وہ تحریریں شایع کی گئی ہیں جو تذکرہ کے بعد لکھی گئیں، ان میں بھی ان کے حالات و معمولات کا ذکر ہے، مولانا کی آپ بیتی "آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی" اور "انڈیا ونس فریڈم" بھی ہے لیکن تذکرہ خود مولانا کے جادو نگار قلم کا نتیجہ ہے اس لیے اس کی اہمیت بھی سب سے سوا ہے، فاضل مرتب کے افتتاحیہ میں تینوں کتابوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

الہلال کے تبصرے :- مرتبہ پروفیسر محمود الٰہی، صفحات ۲۴۰ قیمت اٹھارہ روپے۔

الہلال میں وقتاً فوقتاً مولانا کے قلم سے جو تبصرے شایع ہوئے تھے اس انتخاب میں ان کو یکجا کر دیا گیا ہے، اکادمی ان گم شدہ اور نگاہوں سے اوجھل مواد کو اس لیے منظر عام پر لائی ہے کہ اہل نظر مولانا کی تنقیدی بصیرت سے واقف ہو کر اس کو بھی بحث و تحقیق کا موضوع بنائیں، اسمیں مختلف الموضوعات

کتابوں پر الہلال کے علاوہ البلاغ اور دور ثانی کے الہلال کے تبصرے بھی شامل ہیں جو اکثر مولانا ہی کے قلم سے ہیں اور ان سے ان کی وسعت نظر و مطالعہ، صحیح نقطۂ نظر اور قوت نقد کا اندازہ ہوتا ہے۔ مقدمہ میں ان سب امور پر مختصر مگر جامع بحث کی گئی ہے۔

یادگار آزاد:۔ مرتبہ پروفیسر عبد القوی دسنوی، صفحات ۱۶۸، قیمت ۱۲ روپیے۔

یہ کتاب مولانا کی اور ان کے بارے میں دوسروں کی تحریروں کا اشاریہ ہے، اس کے ایک حصہ میں خود مولانا کی مطبوعات، مضامین اور تحریروں کے اشاریے دیے گئے ہیں اور دوسرے میں اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں ان پر شامل مضامین اور مستقل کتابوں کا اشاریہ ہے، رسالوں کے خاص نمبروں اور انگریزی تصانیف کا ذکر بھی آگیا ہے۔ فاضل مرتب کو اشاریہ نگاری کا خاص ذوق اور اس کا اچھا سلیقہ ہے، یہ اشاریہ بڑی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے اس سے مولانا پر کام کرنے والوں کو بڑا فائدہ ہوگا۔ مصنف نے "انسانیت موت کے دروازے" کے بارے میں لکھا ہے: "کہا جاتا ہے کہ یہ تصنیف مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی کی ہے" یہ صراحت خود مولانا ملیح آبادی نے کی ہے اور کتاب کے اسلوب و طرز بیان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مولانا کی تصنیف نہیں ہے، مولانا کے نام سے ایک افسانہ محبت یا قربانی بھی کتابی صورت میں طبع ہوا تھا لیکن اس کا اس میں ذکر نہیں ہے، یہ افسانہ بھی مولانا کے بجائے مولانا ملیح آبادی مرحوم ہی کا معلوم ہوتا ہے، مدینہ بجنور میں مولانا پر بکثرت مضامین چھپتے تھے مگر اشاریہ میں چند ہی کا ذکر ہے، پٹنہ سے مولانا کی یادگار میں شاہد رام نگری نے ایک ہفت روزہ

"الکلام" نکالا تھا اور اس میں مولانا پر مضامین شایع ہوتے تھے مگر اشاریے میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

خطبات خلافت مرتبہ پروفیسر محمود الٰہی، صفحات ۲۰۰، قیمت ۱۵ روپیے۔

یہ ہندوستان کی اس مشہور تحریک خلافت کے خطبات صدارت کا انتخاب ہے جس نے پورے ملک میں ہندو مسلم اتحاد اور آزادی کا صور پھونک دیا تھا، اسکے چار خطبے مولانا کے اور پانچ دوسروں کے ہیں، آزاد صد تقریبات کے موقع پر اکادمی نے ان خطبات کو شایع کر کے ایک مفید قومی خدمت انجام دی ہے، پیش لفظ میں تحریک خلافت اور خطبوں کے بارے میں مفید معلومات تحریر کیے گئے ہیں "باقی"

مقالات شام ہمدرد مرتبہ جناب حکیم محمد سعید صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ طباعت ٹائپ، صفحات ۴۰۸ مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت ۱۲۵ روپئے، پتہ: ہمدرد فاونڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی۔ ۱۸

حکیم محمد سعید صاحب کی مسیحائی نے پاکستان میں زندگی کی روح پھونک دی ہے مگر ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول، انھوں نے طب و حکمت کے علاوہ بھی اپنی خدمت و سرگرمی کے گوناگوں میدان تلاش کر لیے ہیں، ان کا دردمند دل اپنے وطن اور بنی آدم کو محبت و الفت کا نو بہ نو پیام دیتا رہتا ہے محبت اور اس کی دعوت کو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے ع میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے، ۸۵ء میں یہ متاع گراں مایہ اپنے قافلے اور ملک والوں میں لٹانے کے لیے انھوں نے شام ہمدرد کا موضوع "آؤ محبت کریں" رکھا تھا، یہ کتاب شام ہمدرد کے مقالات کا مجموعہ ہے جس کی نوعیت و قدر و قیمت اور حکیم صاحب کے ذہن کی دراکی اور نکتہ سنجی کا اندازہ ان عنوانات سے ہوگا، آؤ پاکستان سے محبت کریں، آؤ اپنے فوجی جوان سے محبت کریں، آؤ مریض سے محبت کریں، آؤ آزادی سے محبت کریں، آؤ کسان سے محبت کریں، آؤ آئین سے محبت کریں، آؤ عدل و انصاف

سے محبت کریں، آؤ اپنے جمہور سے محبت کریں، آؤ اپنی تاریخ سے محبت کریں، آؤ قناعت سے محبت کریں، آؤ طلبہ سے محبت کریں، آؤ کتاب سے محبت کریں، آؤ اہل فکر و نظر سے محبت کریں، آؤ بانیین پاکستان سے محبت کریں، آؤ بچوں سے محبت کریں، آؤ سائنس سے محبت کریں، آؤ بزرگوں سے محبت کریں، آؤ اپنی زبان سے محبت کریں، آؤ اسلامی تہذیب و ثقافت سے محبت کریں، ان موضوعات پر پاکستان کے ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے ماہرین اور دانشوروں نے اظہار خیال کیا ہے، ہر مقالہ سے پہلے حکیم صاحب کے افتتاحی کلمات اور بعض صدارتی تقریریں بھی درج ہیں، ان سب میں پاکستان کے تعلق سے محبت، اخلاص، دل نوازی اور اصل موضوع کی اہمیت وغیرہ پوری طرح واضح کی گئی ہے، مقررین اور حاضرین کی تصویروں کے عکس بھی دیے گئے ہیں، محبت و الفت کی اس صلائے عام پر سب کو لبیک کہنا چاہیے۔

قصیدتان رائعتان از مولانا احمد رضا بریلوی مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰، پتہ: المجمع الاسلامی محمد آباد ضلع مئو۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی مرحوم ذہانت و طباعی اور مختلف فنون میں مکمل دسترس کی بنا پر بہت ممتاز تھے ان کو شعر و ادب کا بھی اچھا اور عمدہ ذوق تھا نعت گوئی میں اپنی مثال آپ تھے، اردو کی طرح فارسی و عربی نظم و نثر لکھنے پر بڑی قدرت تھی، یہ انکے دو عربی قصائد کا مجموعہ ہے جو مولانا فضل رسول بدایونی کی مدح میں کہے گئے تھے انکے اشعار کی تعداد شرکائے بدر کی مناسبت سے ۳۱۳ ہے، دونوں قصیدوں سے مولانا کی جودت طبع اور قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے، شروع میں ناشر نے مولانا کے حالات و کمالات اختصار و جامعیت سے لکھے ہیں۔

"ض"